

جہادِ مسکے خلاف

جنگ

عبد العليم اصلاحي

سعيد آباد
حيدرآباد

مکتبہ القصی
لاہور

اسلامی فکر کیا ہے

ایک تنقیدی جائزہ

از

عبدالعظیم اصلاحی

مکتبہ الاقصیٰ سعید آباد حیدر آباد (اے۔ پی)

فہرست مضامین

5	تمہید
8	دعوت حق کی مخالفت
28	مسلمان کا قاتلہ مقام
36	صحابی رسول کا قول
43	سیاست کی اہمیت
44	معیار صحیح و غلط
45	اسلام کا اصل مقصد
47	یہ کیا ذہنیت ہے؟
47	اقوام متحدہ
49	امام اور قائد کی حیثیت
51	فقہ کی رہنمائی
55	شاہ رسول
57	دینی لٹریچر
60	مسائل قدیم و دلائل جدید
62	گمراہی کی بات
63	سیکولرزم
69	جہاد
74	بینک کا سود
75	اسلامی مشن
76	آسمان اور مشکل چیز
77	جنگ میں پہل
78	مسلم ملک یا غیر مسلم ملک
82	آپریشن رحمت کے خلاف نہیں ہے
83	غیر مسلم حکمران کا معاملہ
87	ایک عجیب تنقید
89	آیت قرآنی سے غلط استدلال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

اس وقت پوری دنیا میں حتیٰ کہ تہذیب جدید کے اصل مراکز میں بھی اسلامی پسندی اور اسلامی تحریک صرف زندہ ہی نہیں بلکہ ہاتھ پیر مارتی ہوئی نظر آتی ہے مخالف کیمپ انتہائی مضبوط موقف میں ہے اعلیٰ عصری ذرائع و وسائل اور اسلحہ کے ساتھ لیس ہے اس کے ہاں جو جرات رندانہ اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا جانا حیرت انگیز ہے اس کی چھوٹی سی مثال امریکہ کے صوبہ خانہ میں ایک نابینا عالم شیخ عبدالرحمن کی موجودگی ہے یہ معمولی واقعہ نہیں ہے کہ آنکھوں سے معذور ایک شخص دنیا کی سو پر طاقت کے مد مقابل ڈنا ہوا ہے۔

سہ روزہ "دعوت" لکھتا ہے۔

دنیا کی واحد سپر طاقت

ایک نابینا اور ضعیف عالم سے خوف زدہ

ایک نابینا، ضعیف، بیمار اور امریکہ کی حکومت کی اجازت سے امریکہ میں رہائش پذیر مصری عالم شیخ عمر عبدالرحمن اور ان کے بھائیوں کو سزائے قید دیے جانے پر شدید رد عمل ظاہر کرتے ہوئے ایک اسلام پسند مصری تنظیم نے دھمکی دی ہے کہ اگر شیخ عمر عبدالرحمن اور ان کے بھائیوں کو رہا نہ کیا گیا تو تمام دنیا میں 1991 امریکی مفادات پر وار کیا جائے گا۔

گزشتہ ہفتہ ایک نجلی عدالت نے شیخ عمر عبدالرحمن کو دیگر

نوافراد کے ساتھ سزائیں سنائی تھیں۔ شیخ عمر عبدالرحمن کو عمر قید کی سزا دی گئی ہے۔ ان پر اقوام متحدہ کی عمارت، حکومت امریکہ کی ایک عمارت اور نیویارک کی دوسرے گلوں میں دھماکے کرنے کی سازش کا الزام لگایا گیا تھا۔ حکومت امریکہ کی طرف سے اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ اگر شیخ عمر عبدالرحمن ایک خطرناک شخصیت تھے تو ان کو امریکہ میں داخلہ کی اجازت کیوں دی گئی اور ان کی سرگرمیوں کو کیوں جاری رہنے دیا گیا۔ سیاسی مبصرین نے کہا ہے کہ امریکی عدالت کے فیصلے کی پشت پر اسلام دشمنی اور نسل پرستی کے جذبات نمایاں ہیں۔ یہ مبصرین یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ دنیا کی واحد سپر طاقت ایک نابینا اور ضعیف مسلم عالم سے کیوں خوفزدہ ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مغربی نیو اورجینسیوں نے شیخ عمر عبدالرحمن کے خلاف مقدمہ کے فیصلے کے خبریں دیتے ہوئے ان کے نابینا ہونے کا تذکرہ نہیں کیا تھا)۔ (5 / جنوری -

(1996)

اسلام پسند اور تحریکات اسلامی سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دماغوں میں اسلام کو حکمران بنانے، اسلام کو غالب کرنے اور اسلامی قوانین کو جاری و نافذ کرنے کی آرزوئیں اور نظریات پرورش پا رہے ہیں اور جو مخالف اسلام عقائد، خیالات اور افکار کا علمی اور عملی دونوں میدانوں میں مقابلہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں اس صورت حال کو دیکھ کر اسلام مخالف حلقوں میں ایک تہلکہ مچا ہوا ہے حالانکہ اسلام پسندوں کے مقابلہ میں مخالف طاقتوں کی وہی پوزیشن ہے جو نابینا شیخ عبدالرحمن کے مقابلہ میں امریکہ کو حاصل ہے۔ جب دو متضاد قوتوں کے درمیان یہ نسبت ہو تو ظاہر ہے کہ کمزور فریق کا کتنا نقصان ہوگا اور اس پر کتنی مار پڑے گی اس کا کوئی اندازہ

نہیں لگایا جاسکتا چنانچہ اس تصادم اور ٹکراؤ کے نتیجہ میں جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں ان کا حوالہ دیکر مسلمانوں میں سے ایک دانشور طبقہ اپنی اعلیٰ قابلیتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ سامنے آ رہا ہے اسلام پسندوں کو مطعون کر رہا ہے اور عقلی، اخلاقی اور دینی ہر پہلو سے ان کو غلط بتا رہا ہے اور اعلان کر رہا ہے کہ اس کے لیے وہ اسلامی تاریخ کی نئی توجیہ، قرآنی اور دینی اصطلاحات کو ایک نیا معنی پہناتے ہوئے دینی اقدار اور مسلمات کا تیا پانچا کر دے رہے ہیں کہ اس کے بغیر وہ اسلام پسندی کی رو کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں موجودہ حالات کے اس پس منظر میں اس قسم کے دانشوروں کی ہمت افزائی اگر وقت کی غالب تہذیب کے علمبرداروں کی طرف سے بھی کی جا رہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ اسلام پسندوں سے بہت سی علمی، عملی، اخلاقی اور فنی کمزوریاں سرزد ہو رہی ہوں گی۔ جن پر نکیر کرنی چاہئے اور ان کی اصلاح کے لیے واجبی کوشش بھی ہونی چاہئے۔ مگر اس کے بجائے یہ مسلمان دانشور مستشرقین یورپ اور فسطائیت اور جارحانہ فرقہ پرستی کے نمائندوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فکر اسلامی کو قصور وار ٹھہرا رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس کی اصل وجہ یہ فکر ہے۔ لیکن ان کی بات کو کم از کم اسلامی دنیا کوئی وزن نہیں دے سکتی تھی اس لیے انہوں نے کتاب و سنت پر مبنی سلف صالحین سے ورثہ میں ملے ہوئے جذبہ اور فکر ہی پر ہمیشہ چلانا شروع کر دیا۔ اور گزشتہ تقریباً چار سو سال کے علماء اور مصلحین کو بے خبر اور کتاب و سنت سے نابالغ قرار دیا جانا ضروری ٹھہرا ایک طرف یہ ہے اور دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جارحانہ اور ظلم و بربریت کا مظاہرہ کرنے والوں پر نگاہ غلط بھی ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

حق سے اگر غرض ہے تو نہیہا کیا یہ بات
اسلام کا محاسب یورپ سے درگزر

اس سلسلہ کی ایک تحریر برادر محترم مولانا وحید الدین خاص صاحب کی "فکر اسلامی کے نام سے شائع ہوئی ہے اور بطور خاص مجھے بھی ایک صاحب نے عنایت کی۔ اور پڑھنے کی خواہش کی۔ پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے چند مباحث کا نوٹس لینا ضروری سمجھا گیا۔

دعوت حق کی مخالفت

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

علامہ اقبال نے اس شعر میں ایک تاریخی حقیقت کی ترجمانی کی۔ برادر محترم! اسکو تسلیم نہیں کرتے اور اس کو بے خبری اور زمانہ عاشقانی کا ایک نمونہ قرار دیتے ہیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کا ناقابل تلافی نقصان ہو رہا ہے اس تاریخی حقیقت کو رد کرنے کے لیے مولانا مودودی کی ایک عبارت پر تبصرہ کرتے ہیں برادر محترم لکھتے ہیں۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک اسلام ایک مکمل سیاسی انقلاب کی تحریک ہے اس سلسلہ میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ پر جوش طور پر لکھتے ہیں "آج دنیا آپ کے موزن کو اشعدان لالہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں اور نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کو اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرماں روا نہیں ہے۔ کوئی

حکومت میں تسلیم نہیں کرتا۔ کسی قانون کو میں نہیں مانتا۔ کسی عدالت کے حدود اختیارات مجھ تک نہیں پہنچتے۔ کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے۔ کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں۔ کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا۔ ایک اللہ کے سوا میں سب سے منحرف ہوں۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خود کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بکھو اور درندے ہی درندے ہیں۔“

اسلامی سیاست، دہلی ۱۹۸۶، صفحہ ۷۶-۱۷۵۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ پرجوش الفاظ اس لیے لکھے کہ انہوں نے دیکھا کہ آج ہماری مسجدوں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی ہے تو کوئی اس کی وجہ سے ہم سے لڑنے نہیں آتا۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں توحید کی آواز بلند کی تو ہر طرف سے تشددانہ مخالفت شروع ہو گئی۔ کسی کو گھردالوں نے نکال دیا کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گسیٹا گیا۔ کسی کی سریا زار ہتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر بھاڑ دیا گیا۔ ”فکر اسلامی (صفحہ ۱۷۷)

یہ الفاظ دور جدید سے بے خبری کا ثبوت ہیں۔ مصنف اگر زمانہ حاضر سے گہری واقفیت رکھتے تو وہ چلتے کہ اس فرق کا سبب زمانی عامل (AGE FACTOR) ہے۔ قدیم زمانہ مذہبی

تغصب (RELIGIOUS PERSECUTION) کا زمانہ تھا، موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ مذکورہ فرق لالہ الاٹھ کے سیاسی مفہوم کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ زمانی فرق کا معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود سید ابوالاعلیٰ مودودی جو یقینی طور پر اس ”انقلابی مفہوم“ کے حامل تھے، انہوں نے اور ان کی جماعت نے غیر مستقیم ہندوستان میں دس سال تک اپنے انقلابی مفہوم کے مطابق ”اذان“ دی۔ مگر یہاں کی حکومت نے کبھی اس بنا پر ان کی پکڑ دھکڑنے کی۔ اور نہ ان کے سروں پر اس وجہ سے آڑے چلائے گئے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اگر اس زمانی فرق کو جانتے تو اس کو وہ اسلامی دعوت کے حق میں ایک عظیم امکان سمجھتے۔ مگر اس فرق کی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے وہ اس کو استعمال نہ کر سکے بلکہ فکر اسلامی صفحہ ۲۰۲

یہاں ضمنی طور پر ہم دو باتوں کی وضاحت کرنی ضروری سمجھتے ہیں اول یہ کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اسلام کو محض مکمل سیاسی انقلابی کی ہی تحریک نہیں سمجھتے بلکہ ہر اعتبار سے اسلام کو مکمل سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک ہر شخصہ زندگی میں خواہ معاشی ہو یا معاشرتی اخلاقی ہو کہ سیاسی اسلام انقلاب کا داعی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ برادر محترم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا مودودی پھانسی کی سزا کا فیصلہ سن کر مسکرا چکے ہیں۔ اور جہاں تک ہندوستان کی بات ہے ہم کہہ سکتے ہیں جماعت اسلامی کے مرکزی قائدین میں سے شاید ہی کوئی ہو جس نے جیل کی روٹی نہ کھائی ہو۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مذہبی کے واسطے دار و رسن کہاں

اس بات کا اعتراف برادر محترم نے خود بھی کیا ہے لیکن یہاں بھول گئے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

(اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دعوت حق کے تمام جدید امکانات تباہ ہو کر رہ گئے۔ مدعو انتہائی غیر واقعی طور پر داعی کا حریف بن گیا دونوں کے درمیان داعیانہ تعلق ایک خود پیدا کردہ حریفانہ تعلق میں تبدیل ہو گیا) صفحہ ۱۱

مذکورہ بالا دونوں اقتباسوں کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ دعوت حق کو سیاست اور حکومت کے دائرہ میں قدم نہیں رکھنا چاہئے۔ لیکن آج کچھ لوگوں نے دعوت کی ایسی سیاسی اور انقلابی تعبیر کی کہ حکمران طبقہ دعوت کا مد مقابل اور مخالف بن گیا۔

دعوت کی پوری تاریخ میں ایک عام آدمی دیکھتا ہے کہ نمرود، فرعون اور سرداران قریش جیسے سربراہان وہ لوگوں نے ہمیشہ دعوت کی مخالفت کی ہے چونکہ تاریخی طور پر اس کا انکار ممکن نہیں تھا اس لیے اس خلش کو دور کرنے اور سامنے کے آدمی کو خاموش کرنے کے لیے یہ توجیہ پیش کر دی گئی کہ اب زمانہ بدل گیا اور اس دور کے نئے داعیان اسلام اس تبدیلی کو سمجھ نہیں سکے۔ تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا۔ جب کہ سرکاری مذہب کے سوا کسی دوسرے مذہب کے لیے آزادی نہیں تھی اس کے برخلاف موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے اس بات کو نہ سمجھنے کی بنا پر یہ سمجھ لیا گیا کہ دعوت کے صحیح ہونے کی علامت حکمران طبقہ کی مخالفت ہے۔

یہاں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ کہ برادر محترم سیاسی تعبیر کو غلط کہنے کی صرف ایک دلیل دے رہے ہیں وہ ہے حکمران طبقہ کا مد مقابل اور مخالف بن جانا جس کی بنا پر دعوت کے بہت سارے امکانات ختم ہو گئے اور نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کا جانی و مالی بھاری نقصان ہو رہا ہے اس پس منظر میں یہاں تین سوال اٹھتے ہیں۔

- (۱) یاد واقعی زمانہ میں وہ تبدیلی ہوئی ہے جس کی نشاندہی کی گئی ہے۔
 (۲) کیا واقعی دعوت اسلامی کی مخالفت ہمیشہ کی گئی ہے اگر کی گئی ہے تو کیوں

(۳) دعوت اسلامی کے بنیادی اجزاء کیا ہیں؟

اب ہم ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ کے حالات بدلتے رہتے ہیں کوئی دور تھا جب کہ سارے کام پتھر سے لیے جاتے تھے جس کو پتھر کا دور کہا جاتا ہے اس کے بعد لوہے کا دور آیا اور انسان اپنی بیشتر ضروریات پوری کرنے کے لیے لوہا استعمال کرنے لگا اسی طرح موجودہ دور اپنی خصوصیات کی بنا پر سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زمانہ کی ساری تبدیلیوں کے باوجود انسان انسان ہی رہا۔ اس کی فطرت اور نفسیات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے اور نہ آسکتی ہے۔ انسان ہی کیا قدرت نے اول دن جس شئی کو جس خاصیت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے وہ خاصیت اس کے ساتھ قیامت تک لگی رہے گی اس طرح انسان پہلے دن جیسا تھا آخری دن بھی ویسا ہی رہے گا۔ اس کی فطرت میں تبدیلی ہونے والی نہیں ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ حالات بدلے ہیں مختلف میدانوں میں ان گنت ترقیاں اور تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور انسان نے ہر میدان میں فنی اور انتظامی لحاظ سے اپنے معاملات زندگی کو منظم کیا ہے یہ چیز سماجیات۔ اقتصادیات اور سیاسیات سبھی شعبوں میں دیکھی جاسکتی ہے ہر چیز کو ایک فن اور سمجھ بٹا کر محنت کی جارہی ہے ایسی حالت میں ہر شعبہ زندگی میں رد و بدل ہوگا اور ترقی بھی ہوگی مثلاً آجر اور مستحیر کے درمیان تعلق کیا ہوا ان دونوں کے حقوق کیا ہیں۔ ان کو الگ الگ کن باتوں کا پابند ہونا چاہیے یہ سوالات اور مسائل ہمیشہ سے رہے ہیں۔ لیکن پہلے کے مقابلہ میں آج ان کو زیادہ منظم کیا گیا ہے اسی طرح حکمران اور رعایا کے باہمی ربط و

تعلق اور حقوق کو دفعہ واری انداز میں مستظم اور مرتب کیا گیا ہے خاندان کا دائرہ کیا ہے سہلجی حد کیا ہے سیاست کا عمل و فعل کہاں تک رہے اسی پس منظر میں مذہب اور سیاست کو دو خانوں میں بانٹ کر دونوں کی سرحدیں متعین کر دی گئی ہیں یہ ایک طرح کا بند و بست اپنایا گیا ہے تاکہ ٹکراؤ سے بچا جائے۔ مگر اس کے باوجود مذہب اور سیاست کا تصادم ہوتا رہتا ہے جب کہ ہوتا رہا ہے اس کی وجہ یہ بتانا کہ پہلے زمانہ میں حکمران کا مذہب قبول کرنا ہر شخص کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے ٹکراؤ ہو رہا تھا خلاف واقعہ اور فضول سی توجیہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو برس تبلیغ کرتے رہے اور مخالفتوں کا سامنے کرتے رہے یعنی اتنی طویل مدت تک حکمران طبقہ کا دین آپ نے قبول نہیں کیا۔ مصر میں بنی اسرائیل خواہ کتنے ہی بے عمل اور بگڑے ہوئے تھے لیکن کہیں سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے فرعون کا دین قبول کر لیا ہو۔ جیسے تیسے بہر صورت وہ مسلمان کی حیثیت میں اپنی الگ شناخت رکھتے تھے۔ اگر وہ ویسے ہی پڑے رہتے اور موسیٰ علیہ السلام ان کو دغظ سناتے رہتے تو کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوتا۔ مسئلہ اس وقت کھڑا ہوا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں دعوت حق لے کر پہنچے۔ اللہ کی عبادت کرو۔ اور میری اطاعت کرو، بنی اسرائیل پر ظلم ستم بند کرو۔ فرعون نے یہ نہیں کہا کہ تم اپنے گھر میں میرے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت کیوں کرتے ہو۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام نے جا کر کہا کہ تم حاکم نہیں ہو۔ تم بندے ہو۔ سرکشی چھوڑو۔ بندگی اختیار کرو۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کا معاملہ ہے پہلے نمرود نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ تم دوسرے مذہب کو کیوں مانتے ہو۔ میرے مذہب کو قبول کرو۔ چھیزا تو پہلے حضرت ابراہیم نے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر۔ بے زور۔ کمزور اور عاجز پتھر کی مورتیوں کو کیسے پوجتے ہو۔ اللہ کی عبادت کرو اور میری اطاعت کرو۔ اسی طرح نبی آخر الزماں کا معاملہ ہے سرداران قریش نے اگر نہیں کہا کہ ہمارے حین سو ساٹھ بتوں کو کیوں نہیں پوجتے۔ وہاں تو

بڑی آزادی تھی۔ ہر قبیلہ کا ایک الگ بت تھا۔ بڑی سیکولر فضا تھی۔ کشمکش اس وقت شروع ہوئی جب کہ آپ نے اپنے قریبی لوگوں کو بلا کر صاف صاف بتا دیا کہ تم جس راہ پر چل رہے ہو ہلاکت کی طرف جارہی ہے کوہ صفا پر چڑھ کر عام آواز لگائی۔ اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت اور اپنی اطاعت کی دعوت دی۔ گویا اعتراض یہ نہیں تھا کہ ایک شخص ہمارے عقیدہ کے سوا دوسرا عقیدہ کیوں رکھتا ہے بلکہ اعتراض کی بات یہ تھی کہ یہ شخص ہمارے عقیدہ کو غلط بتاتا ہے اور اپنے عقیدہ کو نہ صرف یہ کہ صحیح قرار دیتا ہے بلکہ اس کی تبلیغ اس انداز میں کرتا ہے کہ لوگ اپنے سابقہ عقیدہ کو چھوڑ کر اس کے پیروکار بن جائیں۔ یہ وہ بات تھی جس نے تھلکہ مچا دیا۔ مولانا حالی نے اسی کو کہا ہے۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی

عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

پھر دیکھئے اللہ کے بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر اس ضمن میں کبر و مانز کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ فریق مخالف کی طرف سے بار بار کوشش کی گئی کہ تھوڑی کمی و بیشی کر کے کشمکش کو ختم کیا جائے لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے موقف سے ذرہ برابر ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوئے اس رخ سے تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آئے گا پہلے اور اب کو اس طرح تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے کہ اب مذہبی آزادی کا دور ہے اور پہلے مذہبی جبر کا دور تھا۔ یہ تاریخ کا نہایت سطحی مطالعہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب بے لاگ لپیٹ اور غیر لچکدار انبیائی طریق دعوت اپنایا جائے گا تو کشمکش اور محاذ آرائی سے معز نہیں ہوگا

اس دور میں ترقی یہ ہوئی ہے کہ مذہب اور سیاست کی قدیم لڑائی کو ختم کرنے کے لیے اہل سیاست نے صلح کی ایک راہ نکالی ہے اہل مذہب کی طرف سے نہیں بلکہ اہل سیاست کی جانب سے کبر و مانز کی کوشش کی گئی ہے اور چونکہ اہل سیاست

کے پاس سارے وسائل و ذرائع ہیں اس لیے انہوں نے اپنے موثر ترین ذرائع ابلاغ اور اپنی اعلیٰ تکنک سے کام لیتے ہوئے ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایسا ہونا ہی چاہیے۔ کہ مذہب سیاست میں دخل نہ دے بلکہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سیاسی میدان میں آج جو سب سے بڑی گالی دی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ فلاں شخص مذہب اور سیاست کو غلط ملط کر رہا ہے اور دوسری طرف مذہبی لوگوں نے حالات کے دباؤ کے تحت گوشہ نشینی کو ترجیح دینے پر مجبور ہو گئے مذہب اور سیاست کے درمیان صلح کے جس فارمولہ کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس کا نام ہے سیکولر ازم اہل سیاست کی یہاں بھی یہ ایک عیاری اور فریب کاری دیکھی جاسکتی ہے کہ وہ عام طور پر سیکولر ازم کے ایک رخ کو نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں کہ سیکولر ازم کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا کسی مذہب کی طرف فدا داری حکومت نہیں کرے گی۔ اس نظام حکومت میں تمام مذاہب کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ سیکولر ازم کے دوسرے رخ کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ وہ یہ کہ کسی مذہب کو سیاسی اور اجتماعی امور میں دخل دینے کا حق نہیں ہوگا۔ مذہب کا دائرہ پرائیویٹ زندگی سے آگے نہیں ہے سیکولر ازم کا یہ دوسرا رخ بھی کوئی نظری نہیں بلکہ ایک عملی حقیقت ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جن کے مذہب میں اجتماعی زندگی کے امور و معاملات سے متعلق ہدایات اور تعلیمات نہیں ہیں ان کا اس فریب میں ہٹنا ہونا قرین قیاس ہے لیکن جن کا مذہب نجی زندگی، خاندان، معاشرہ، سوسائٹی اور امور مملکت و سیاست سے یکساں طور پر بحث کرتا ہے اور جن کا دعویٰ ہے کہ ان کا مذہب ہمہ گیر اور جامع نظام زندگی ہے اور اس کے کسی بھی جز کو چھوڑنا بھاری جرم ہوتا ہے ان کا سیکولر ازم کے فریب میں ہٹنا ہونا کیا معنی رکھتا ہے وہ لوگ آخر کسی طرح مذہب کی اجتماعی زندگی سے متعلق تعلیمات کو نظر انداز کر سکتے ہیں چنانچہ یہ

ایک صاف بات ہے کہ ایک غیر مسلم نے ابھی حال میں لکھا ہے کہ جو لوگ اپنے مذہب کے متعلق ہمہ گیر اور جامع نظام زندگی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے منہ سے سیکولرزم کی بات ناقابل فہم ہے۔

غرض یہ کہ مذہبی جبر اور مذہبی آزادی کے دو زمانوں میں حالات زمانہ کو تقسیم کرنا بالکل ایک مفروضہ ہے جس کا کوئی سر ہے اور نہ پیر۔ کبھی پہلے سراسر جبر کا دور تھا اور نہ اب سراسر مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔

پہلے بھی حکمران طبقہ اپنے مصالح کے تحت جبر یا آزادی کی پالیسی اختیار کرتے تھے اور آج بھی سیکولر حکومتیں خالص اپنی مصطلحوں کو سامنے رکھ کر جبر پر مبنی یا آزادی پر مبنی پالیسیاں بناتی ہیں اور رویہ اختیار کرتی ہیں آج ایک حد تو وہ ہے کہ جس میں مذہب کا نام لینا ثابت ہو جائے تو بحیثیت ممبر پارلیمنٹ و ممبر اسمبلی کامیاب آدمی ناکام قرار دے دیا جائے گا جرم قتل کی سزا بھگتنے والا آدمی جیل میں۔ ہتھکڑیاں پارلیمنٹ کی سیٹ جیت سکتا ہے لیکن ایک مذہبی آدمی اپنی مذہبی حیثیت میں نہ پارلیمنٹ کی ممبری کا امیدوار بن سکتا ہے نہ سیاسی فیملڈ میں کام کر سکتا ہے اور اگر وہ کرتا ہے تو ناقابل قرار دیا جائے گا دوسری حد وہ ہے جہاں آزادی دی گئی ہے وہ آزادی بھی بسا اوقات سلب کر لی جاتی ہے مثلاً کئی مواقع پر ایسا ہوا ہے کہ مساجد میں جمعہ کی نماز نہیں ہو سکی۔ اور جس نے مسجد میں پہنچنے کی کوشش کی وہ پکڑا گیا اس لیے کہ انتظامی لحاظ سے جو قانون لاگو کیا گیا ہوتا ہے وہ ان خاص حالات میں اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص گھر سے باہر قدم نکالے۔ ہندوستان کے بڑے علاقہ میں گائے کی قربانی نہیں کی جاسکتی۔ کیوں۔ اس لیے کہ اکثریتی طبقہ کو یہ چیز ناپسند ہے۔ سیکولر نظام نے مذہبی آزادی دی ہے تو آخر اس کی حفاظت کیوں نہیں کی جاتی۔ باہری مسجد میں سیکڑوں برس سے نماز پڑھی جا رہی تھی جب انتظامی مصطلحوں کا اتفاق ہوا۔ نمازیوں کے لیے مسجد بند کر دی گئی۔ اور پچاس سال کے عرصہ میں بھی سیکولر عدالت کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ نقص

امن کے اندیشہ کے تحت نمازی کے لیے مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ لیکن دوسری طرف دن کی روشنی میں مسجد کو مہدم کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کی جگہ مندر تعمیر کیا جاتا ہے اور جب وہ اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں تو پورے اعزاز کے ساتھ بحفاظت انہیں ان کے گھروں تک پہنچایا جاتا ہے یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ حکمران طبقہ کی مصیبتوں کا یہی تقاضا تھا۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔

ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

۲ کیا واقعی دعوت اسلامی کی ہمیشہ مخالفت کی گئی ہے اگر ایسا ہے تو کیوں؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا سب سے معتبر ماخذ قرآن کریم ہے قرآن میں کل چھبیس ۲۶ انبیاء کرام کا ذکر آیا ہے ان میں سے کسی ایک کو بھی اس حیثیت سے نہیں پیش کیا گیا ہے کہ فلاں نبی کے حسن سیرت، حسن کردار اور حسن سلوک کی بناء پر قوم نے ان کی واہ واہ کی اور ہاتھوں ہاتھ لیا یا فلاں نبی نے اعلیٰ درجہ کی حکمت، موعظہ حسنہ اور مجاہدہ احسن کے ساتھ دعوت پیش کی کہ پوری قوم گرویدہ ہو کر حلقہ بگوش لہان ہو گئی اس کے برخلاف قرآن جو منظر پیش کرتا ہے اس کے لیے مندرجہ ذیل آیات اور ان کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے۔

قل قد جاءکم رسل من قبلی بالبینت وبالذی قلتم فلم

قتلتهم ان کنتم صدقین (۱۸۳) آل عمران

ان سے کہو تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لاتے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا ذکر تم کرتے ہو پھر تم نے ان رسولوں کو کیوں قتل کیا۔ اگر تم سچے ہو۔

فان کذبوک فقد کذب رسل من قبلک جاوء بالبینت

والزبر والکتب المنیر (۱۸۴) سورہ آل عمران

اب اے نبیؐ اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی کھلی نغائیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔

والقداستھزی برسل من قبلک فحاق بالذین مسخروا
منھم ماکانوا بہ يستھزون (الانعام: ۱۰)

اے نبیؐ تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے، تم ان مذاق اڑانے والوں پر آخر کار وہی حقیقت مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے

وکذلک جعلنا لکل نبیٰ عدوا شیطین الانس والجن
یوحیٰ بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا ولوشاء ربک
ما فعلوا فذرھم وما یفترون (الانعام: ۱۱۲)

اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبیؐ کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے رہے ہیں اگر تمہارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے پس تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں۔

کذبت قبلھم قوم نوح وعاد وفرعون ذوالاوتاد وثمود
وقوم لوط واصحاب النیکتہ اولئک الاحزاب ان کل الاکذب
المرسل فحق عقاب. (ص ۱۳-۱۲)

ان سے پہلے نوحؑ کی قوم اور عاد اور فرعونؑ اور ثمود اور قوم لوطؑ اور ایک والے جھٹلا چکے ہیں، جتنے وہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور میری عقوبت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا۔

وکاین من قریتہ عتت عن امر ربھا ورسلہ فحاسبنھا

حساباً شدیداً وعذاباً ثکراً (الطلاق ۸)

کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی توہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔

ولقد کذبت رسل من قبلك و صبر و اعلى ما کذبوا
واوذوا حتی اتهم نصرنا ولا مبدل لکلمت اللہ ولقد جاءک
من نبای المرسلین (الانعام ۳۳)

تم سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں انہوں نے صبر کیا جہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ ہمیشہ آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔

ان الذین یکفرون بایت اللہ ویقتلون النبین بغير حق
ویقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس فبشرهم بعذاب الیم
(ال عمران ۲۱)

جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے ورپہ ہو جاتے ہیں جو خلق خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے کے لئے انھیں ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دو۔

لقد اخذنا میثاق بنی اسرائیل وارسلنا الیهم رسلاً ط
کلما جاءهم رسول بما لا تهوی انفسهم فریقا کذبوا و فریقا
یقتلون (المائدہ ۷۰)

ہم نے بنی اسرائیل سے ہختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لیکر آیا تو کسی

کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا۔

قرآن کی ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ داعیان حق کو ہمیشہ کشمکش اور آزمائش سے گزرنا پڑا ہے ان کے ساتھ استہرا بھی کیا گیا مار پیٹ کی اذیت بھی دی گئی گھر بار سے نکالا بھی گیا قتل بھی کیا گیا، آڑے سے جسم کو چیرا گیا اور سولی پر چڑھانے کی کوشش بھی کئی گئی غرض کوئی ایسی مصیبت نہیں ہے جو ان پر نہ ڈھائی گئی ہو اور یہ ایک ایسا تسلسل ہے جو کہیں ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا ایسی حالت میں اگر یہ کہا جائے کہ آزمائش و ابتلا بھی ایک نمایاں علامت ہے کسی دعوت کے دعوت حق ہونے کی تو اس کی تردید کیونکر کی جاسکتی ہے۔

اس حقیقت کو مزید ایک دوسرے رخ سے سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل آیات پر بھی غور کیا جانا مفید ہو گا آلام و مصائب میں مبتلا کیا جانا اس لیے ضروری بتایا گیا ہے کہ اس کے بغیر بچے اور چھوٹے، کھرے اور کھونے کی تمیز نہیں ہو سکتی۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجْتَهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَنَّكُمْ
اِخْبَارُكُمْ (محمد ۳۱)

ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے کہ تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں۔

لَتَبْلُوَنَّ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اَوْتُوا الْكُتُبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوا اَذْيَ كَثِيْرًا وَاَنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْر (ال عمران ۱۸۶)

مسلمانو! تمہیں مال و جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سناؤ گے اگر ان سب حالات میں تم صبر و خداترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوْا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ

قبلکم مستهم الباسا و الضراء و زلزلوا حتی یقول الرسول
والذین امنو معه متی نصر الله الا ان نصر الله قریب (البقرہ ۲۱۲)

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمہیں مل
جائیگا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے
والوں پر گزر چکا ہے ان پر سختیاں گزریں مصیبتیں آئیں ہلا مارے گئے حتیٰ کہ
وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چنچ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی
(اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخاطبین کے درمیان کشمکش کا یہ
تسلسل ظاہر ہے کہ بلا وجہ نہیں ہو سکتا ضرور بائضرور اس کے پیچھے کوئی وجہ
ہوگی وہ وجہ کیا ہے ہمارا خیال ہے تھوڑے سے غور و تامل سے سمجھ میں آ سکتی
ہے یہاں موٹی موٹی تین وجوہ کو ہم بیان کرتے ہیں۔

پہلی وجہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت مختصر لفظوں میں یوں ہے

فاتقوا الله واطيعون یعنی اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (سورہ

شعرا ۱۲۴)

یہ الفاظ قرآن میں نو دس بار آئے ہیں

يقوم اعبدوا الله مالکم من الہ غیر لا طانی اخاف علیکم

عذاب یوم عظیم (سورہ الاعراف ۵۹)

ترجمہ یعنی اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود

نہیں ہے میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تقویٰ، احسان اور نیکی
بھلائی کی بات کی جائے تو کوئی ایسا نہیں ہوگا جو ناک بھوں چڑھائے سب کو یہ باتیں
اچھی لگتی ہیں بلکہ ہر سننے والا سر دھناتا اور واہ واہ کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ جب یہ

بات بھی جاتی ہے کہ فلاں فلاں کام نہ کر دو اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرو تو بات میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے انبیاء علیہم السلام اور دوسرے عام نیکی اور بھلائی کا پرچار کرنے والوں کے درمیان فرق ہو جاتا ہے انبیاء علیہم السلام جہاں یہ کہتے ہیں کہ نیکی کرو وہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ ان برائیوں سے بچو۔ اسی طرح جہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو وہیں یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو اور جتنے بھی خدائی کے دعویدار ہیں ان سب کو ٹھکرا دو یہیں سے وہ کشمکش اور تصادم شروع ہوتا ہے جس کا ذکر کچھ صفحات میں قرآنی آیات کی روشنی میں کیا گیا ہے چنانچہ شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب سے کہا۔

قالوا یشعیب مانفقہ کثیراً مما نقول وانا لנرک فینا
ضعیفاًج ولولارہطک لرجمنک ومانت علینا بعزیز (ہود ۹۱)

انہوں نے جواب دیا اے شعیب تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے تیرا بل بوتہ تو اہتا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو۔

دیکھئے حضرت صالح کی قوم کیا کہتی ہے۔

قالوا یصلح قد کنت فینا مرجوا قبل هذا اتنہنا ان نعبد
ما یعبد اباونا وانا لفی شک مما تدعونا الیہ مریب (ہود ۶۲)

انہوں نے کہا اے صالح اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلارہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلیجان میں ڈال رکھا ہے۔

اللہ کی عبادت اور اللہ سے تقویٰ کی تلقین اور دعوتِ مثبت بات تھی جس سے کسی کو انکار نہیں ہوتا اور نہ کسی کو ناگواری گزرتی ہے لیکن جب یہ کہا گیا کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو اللہ کے علاوہ کسی کا خوف دل میں نہ رکھو اور فلاں فلاں کام نہ کرو تو تلخی کا پیدا ہونا یقینی ہو گیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت شعیب اور حضرت صالح علیہم السلام نے بندگی رب کی دعوت کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی بندگی اور عبادت کے انکار کی بات کہی اور منکرات سے اجتناب کی نصیحت کی تو قوم کے لوگ اس کو برداشت نہ کر سکے اور وہ جس انتہا کو پہنچے اس کا سہ کرہ ابھی اوپر کیا گیا۔ ایسے ہی ہر نبی نے مثبت اور منفی دعوت کے ساتھ ساتھ اپنے زمانہ کے نمایاں فحشاء اور منکرات کے خلاف موثر آواز بھی اٹھائی ہے ظاہر ہے کہ زمانہ اس کو کیسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتا تھا۔

دوسری وجہ

مثبت اور منفی، جامع اور مانع دعوت بھی گوارا ہو سکتی تھی لیکن اگر تھوڑی رواداری اور نرمی سے کام لیا جاتا اور ذرا لچک دار پالیسی اپنائی جاتی مصیحت اور ہوشیاری کو پیش نظر رکھا جاتا اور خطرات کو خود دعوت دینے کی ابتداء اپنے ہاتھوں نہ کی جاتی چنانچہ اس پہلو سے انبیاء علیہم السلام کا کیا موقف ہے اسے مندرجہ ذیل آیات میں دیکھا جاسکتا ہے۔

فَلَا تَطْعَمُ الْمَكْذِبِينَ وَدَوَّالُو تَدْمِنُوا فَيَدْمِنُونَ (القلم ۹، ۸)

لہذا تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں۔

وَأَنْ كَادُوا لِيَفْتَنَنَّكَ مِنَ الذِّیْ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ

عَلَيْنَا غَيْرَ ۚ وَإِذَا اتَّخَذُوا خَلِيلًا ۚ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ

لقد كدت تركن اليهم شيئا قليلا (بنی اسرائیل ۴۳-۴۴)

اے نبی! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ ہمیں فتنہ میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنالیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔

فاستقم كما امرت ومن تاب معك ولا تطفوا انه بما تعملون بصير ولا تركنوا الي الذين ظلموا فتمسكم النار و
مالکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون (ہود ۱۱۳-۱۱۲)

پس آئے نبی! اور تمہارے وہ ساتھی جو ہلکے آتے ہیں ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمارا رب نگاہ رکھتا ہے ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی پیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی اور سرپرست نہ ملیگا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔

معلوم ہوا کہ دعوت کے باب میں مداخلت مصلحت پرستی، ظالموں کی رو رعایت اور ان کی طرف جھکاؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اگر کوئی داعی اس نقطہ کو مد نظر نہیں رکھتا تو کار دعوت اس کے لیے باعث اجر و ثواب ہونے کے بجائے سخت گرفت کا سبب ہوگا، حکمت و دعوت کے نام پر جس مصلحت پرستی اور مداخلت کا آج عموماً مظاہرہ کیا جا رہا ہے وہ بڑی خطرناک چیز ہے، اللہ کے روبرو حساب کے تصور کے ساتھ اپنی فکر اور اپنے عمل کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، اللہ ہمیں اس فتنہ سے محفوظ رکھے، آمین۔

تمسیری وجہ

ایک اور رخ سے دیکھئے کہ دعوت اسلامی کا اللہ کی عبادت تقویٰ، توکل، انابت اور برائیوں کے ترک کے علاوہ ایک اہم جزئیہ ہے کہ اللہ کے نبی کہتے ہیں اطیعونی (کہ میری اطاعت کرو) چنانچہ قرآن نے یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رُسُلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (النساء ۶۴)

یعنی جو رسول بھی ہم نے بھیجے ہیں اس لیے بھیجے ہیں کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے۔

دعوت کا یہ جز انتہائی اہمیت کا حامل ہے اس سے زمین پر قیادت عکمرانی اور پیشوائی کا دعویٰ کرنے والوں کی کرسی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور قائد کو پیرو اور متبوع کو تابع بن جانے کا الٹی میٹم دیدیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ نبی سلطان کائنات کا نمائندہ ہوتا ہے اس لیے بجا طور پر بلا کسی قید و شرط کے وہ اپنی اطاعت کا مطالبہ کریگا اور خود کسی کی تابعداری یا تختی اور محکومیت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا ہر نمرود، فرعون، ابو جہل و ابوہلب حضرات انبیاء کرام خلیل اللہ حضرت ابراہیمؑ کلیم اللہ حضرت موسیٰؑ اور حبیب خدا حضرت محمدؐ کے درپہ آزار ہو گئے اور اس وقت تک وہ چین سے نہیں بیٹھے جب تک اللہ کے نبی کو ملک بدر نہیں کر دیا بلکہ ملک بدر کرنے کے بعد بھی چین سے نہیں رہنے دیا کہ مبادا کہیں طاقت میں آکر ہمارے لیے خطرہ نہ بن جائیں۔

حضرت موسیٰؑ نے جب فرعون کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو فرعونی حکومت کے بڑے لوگوں نے عوام سے کہا کہ یہ شخص تم کو تمہارے ملک سے بے دخل کر دینا چاہتا ہے سوال یہ ہے کہ فرعونی حکومت نے حضرت موسیٰؑ کے معاملے کو اتنی اہمیت کیوں دی جب کہ ان کے ساتھ اس وقت ان کے بھائی کے علاوہ کوئی

دوسرا ان کا معاون و مددگار نہ تھا۔

اگر ایک غلام قوم کا بے سرو سامان آدمی یکا یک اٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں کھڑا ہوتا ہے جو شام سے یسپیا تک اور بحر روم کے ساحل سے حبش تک کے عظیم الشان ملک کا نہ صرف مطلق الحنان بادشاہ بلکہ معبود بنا ہوا تھا۔ تو محض اس کے اس فعل سے کہ اس نے ایک لاشی کو اڑھا بنا دیا اتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنت مصر کا تختہ الٹ دیگا اور شاہی خاندان کو حکمران طبع سمیت ملک کے اقتدار سے بے دخل کر دیگا؟ پھر یہ سیاسی انقلاب کا خطرہ آخر پیدا بھی کیوں ہوا جب کہ اس شخص نے صرف نبوت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ ہی پیش کیا تھا اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھڑی ہی نہ تھی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ کا دعوائے نبوت اپنے اندر خود یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ دراصل پورے نظام زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کھلی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لیے نہیں آتا بلکہ مطاع اور راعی بننے ہی کے لیے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے رسالت کا دعویٰ سننے ہی فرعون اور اس کے رعیان سلطنت کے سامنے سیاسی و معاشی وار تمدنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہو گیا۔

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم جن کو صادق و امین کہا جاتا تھا اور مکارم اخلاق کا اعلیٰ نمونہ لوگ سمجھتے تھے لیکن جب آپ نے کھل کر اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو مکہ کے ماحول میں جیسے ایک زلزلہ آگیا اور قریش اٹھ پڑے کیونکہ وہ جلتے نھے کہ غیر

اللہ کی الوہیت کے انکار اور رسالت و آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس رسالت کے حوالے کر دیا جائے اور اس کی بے چوں و چرا اطاعت کی جائے، یعنی اس طرح کے دوسرے تو دور کنار خود اپنی جان اور مال تک کے بارے میں کوئی اختیار نہ رہے اور اس کے معنی یہ تھے کہ مکہ والوں کو دینی رنگ میں اہل عرب پر جو بڑائی اور برتری حاصل تھی اس کا صفایا ہو جائے گا اور اللہ اس کے

رسول کی مرضی کے مقابلہ میں انھیں اپنی مرضی پر عمل پیرا ہونے کا اختیار نہ رہیگا، یعنی پہلے طبقے پر انھوں نے جو مظالم روار کھے تھے اور صبح و شام جن برائیوں میں لٹ پٹ رہتے تھے ان سے دست کش ہوتے ہی بنے گی قریش اس مطلب کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اس لئے ان کی طبیعت اس "رسوا کن" پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ آپ کی رسالت پر ایمان لانے کا مطلب تھا۔ آپ کی اطاعت میں پورے طور پر آجانا۔ اپنی خود رائی اور اپنے اقتدار سے دستبردار ہو کر مکمل طریقہ سے آپ کی تابع داری کو اختیار کر لینا جس کے لئے وہ تیار نہ تھے۔

مسلمان کا قائدانہ مقام

فہم عصر حاضر میں اسلامی فکر کی تشکیل نو کا کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی زیادہ وہ مشکل بھی ہے یہ ایک ایسا کام ہے جس میں ایک طرف اگر عصر حاضر کا گہرا مطالعہ ضروری ہے تو اسی کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ آدمی کو اسلام کی تعلیمات اور اس کی روح سے کامل درجہ کی واقفیت حاصل ہو۔ اس دو طرفہ شرط میں ادنیٰ کمی بھی بھیانک غلطی تک پہنچانے کا سبب بن سکتی ہے۔

اس کی ایک مثال "امامت اقوام" کا وہ جدید نظریہ ہے جس کو کچھ مسلم مفکرین نے اسلام کی انقلابی تعبیر کے طور پر پیش کیا ہے اس نظریہ کے مطابق، مسلمان سارے عالم کے قائد اور حاکم ہیں۔ مسلمانوں کو خدا کی طرف سے یہ منصب عطا کیا گیا ہے کہ وہ "انسانی حاکموں" کو بزور تمام دنیا میں اقتدار سے ہٹائیں اور انسانوں کے اوپر خدا کی حکومت (عملی طور پر خود اپنی حکومت) قائم کر دیں۔

اس نام نہاد انقلابی نظریہ کے لئے قرآن یا حدیث رسول میں کوئی دلیل نہیں۔ اس کی دلیل عہد صحابہ کے ایک واقعہ سے نکالی گئی ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانہ میں جب ایرانی حکومت سے مسلمانوں کا ٹکراؤ ہوا۔ تو اس دوران مسلم لشکر کے سردار سعد بن ابی وقاصؓ نے گفٹ و شنید کے لئے کچھ وفد ایرانی حکمرانوں کے یہاں بھیجے۔ ان میں سے ایک ربیع بن عامر تھے۔ ربیع بن عامر جب ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں پہنچے تو رستم سے ان

کی لمبی گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا۔

قال رستم ما جاء بكم قال الله ابتعثنا والله
جاء بنا لتخرج من شاء من عبادة العباد الى
عبادة الله (تاریخ خطیری)

رستم نے پوچھا کہ تم کس لئے ہمارے ملک میں آئے ہو
انہوں نے کہا کہ ہم کو اللہ نے بھیجا ہے اور ہم کو اللہ لے آیا ہے تاکہ
وہ جس کو چاہے اس کو ہم بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی
عبادت کی طرف لے آئیں۔

صحابی کی اس تقریر سے مذکورہ سیدھی نظریہ نکالنا بلاشبہ ایک
نامحسوس جسارت ہے حتیٰ کہ وہ اسلام کی تصویر کو بگاڑنے کے ہم معنی
ہے۔ صحابی کے مذکورہ قول میں اسلام کی توسیعی انسانیت
EXTENDED HUMANITY کو بتایا گیا ہے۔ مگر عدم
واقفیت کی بنا پر غلط تعبیر کر کے اس کو اسلام کی توسیعی سیاست
EXTENDED POLITICS کے معنی میں لیا گیا ہے۔ یہ یقینی
طور پر صحابی کے ایک قول کی نہایت غلط توجیہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ
اس وقت ایرانی حاکموں اور اہل اسلام کے درمیان جنگ پیش آئی۔
لیکن جنگ کی حیثیت پورے معاملہ میں محض اضافی یا اتفاقی تھی۔ وہ
اس کا اصل مطلوب نہ تھی (صفحہ ۱۱-۱۲)

ادھر نقل کردہ اکتباس میں جو بات بڑے اونچے مقام سے برادر محترم نے
فرمائی ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ یہ جاننے کے لئے دو سوالوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۱)۔ یہ نظریہ کہ مسلمان سارے عالم کے قائد اور حاکم ہیں کیا دینی اعتبار سے

صحیح ہے ؟

(۲) کیا اس نظریہ کا ماخذ عہد صحابہ کا محض ایک واقعہ ہے ؟

اس موقع پر قرآن و سنت اور دینی دلائل سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر کے سوچئے دنیا کی ہر قوم اور ہر گروہ کو شش کرتا ہے اور بسا اوقات جان تک کی بازی لگاتا ہے یا کم از کم آرزو اور تمنا رکھتا ہے کہ وہ اقوام عالم کا قائد اور حاکم بنے اس کے لئے اپنی نئی نسل کے اندر ذہنی بیداری، ہمت اور حوصلہ مندی پیدا کرتا ہے ان کے اندر یہ شعور جگانے کے لئے ہر قسم کا جتن کرتا ہے کہ وہ اٹھے اور کم از کم اپنے ہمسایہ قوموں میں عزت اور وقار کا مقام حاصل کرے ہمارے ملک میں کوئی کیونٹی ایسی نہیں ہے جس کے اندر اس طرح کی کوشش نہ ہو رہی ہوں سکھ قوم کی کیفیات کا مطالعہ کیجئے ہزاروں برس سے وہ اپنے ہوئے مظلوم طبقوں کو دیکھتے ان کے اندر کس قدر یہ جذبہ موجزن ہے۔ علاوہ ازیں ہندو قوم کا مجموعہ قائد اور حاکم بننے کے لئے کیا کچھ نہیں کر رہا ہے اس تناظر میں اپنی پست ہمتی، مرعوبیت اور ذہنی و فکری زوال کو دیکھئے کہ غلبہ اور عزت حاصل کرنے اور دنیا کی قیادت و رہنمائی کرنے کی سوچ بھی ذہن و دماغ سے نکال دیئے کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ باوجود کرایا جا رہا ہے کہ یہ سوچ نہ صرف یہ کہ تمہیں دنیا میں تباہ و برباد کر دے گی بلکہ آخرت میں بھی اس غیر مطلوب اور ناجائز تصور اور عمل کو لے کر جاؤ گے تو نجات و فلاح سے محروم ہو جاؤ گے تمہارے لئے امن و عافیت کی بس یہ راہ ہے کہ وقت کی غالب قوموں کے سامنے سر جھکائے ہوئے زمدہ رہو تم کمزور و اقلیت میں ہو تمہارا کام ہر جبر و ظلم کو صبر و شکر کے ساتھ جھیلنے رہنا ہے۔

بتائیے یہ طرز و فکر کیا کسی قوم اور گروہ کو اپنے مقام پر باقی رکھ سکتا ہے۔ چہ جائے کہ عزت اور وقار سے ہمکنار کرے خصوصاً جبکہ یہ ماحول خارج سے بھی پیدا کیا جا رہا ہے اور اندر سے بھی سیاسی و لائل بھی دیئے جا رہے۔۔۔ ہوں اور دینی مقام پر بیٹھ کر دینی زبان اور دینی اصطلاحات میں بھی مسلمانوں کو مغلوبیت، محکومیت کی

حالت میں مطمئن کرنے کی کوشش ہو رہی ہو۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کے زوال کی رفتار کتنی تیز ہو سکتی ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے لیکن افسوس کے اس بے عقلی اور مردہ دلی کو تعمیری اور حقیقت پسندانہ طرز فکر بڑے طمطراق کے ساتھ بلکہ بڑی بے حیائی اور بے شرمی کے ساتھ ثابت کر سنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کے بعد دین کے اصل سرچشموں یعنی کتاب و سنت میں تلاش کیجئے کہ کہیں امت مسلمہ کو محکوم و مغلوب بن کر چھینے کی کوئی تعلقین کی گئی ہے چاہے آپ کتنے ہی دانشورانہ انداز میں اس سوال کا جواب ڈھونڈیں آپ کو ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا اس کے برخلاف آپ پائیں گے کہ جو لوگ کفر سے نہ لڑ سکتے ہوں اور زیر کفر زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی مقدور بھر کوشش نہ کرتے ہوں ان کو سخت وعید سنائی گئی ہے۔

ان الذین توفهم الملكة ظالمی انفسهم قالوا فیم كنتم قالوا كنا مستضعفین فی الارض قالوا الم تكن ارض الله واسعة فتهاجروا فیها ط فاولئك ماوهم جھنم وساءت مصیرا (النساء ۹۷)

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی رو میں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں ہٹا تھے انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے۔

بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں پڑے ہوئے تھے اس سے نجات دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بھیجا۔ اور فرمایا۔

فاتیہ فقولا انا رسول ربك فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبهم قد جننك باية من ربك والسلام علی من اتبع الهدی (ط)

جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لئے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لئے جو راہ راست کی پیروی کرے۔

قرآن میں موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت بکثرت بیان ہوئی ہے اس پوری سرگزشت میں کہیں بھی حضرت موسیٰ فرعون سے کچھ حقوق اور مراعات مانگ کر مصر میں محکوم قوم کی حیثیت سے زندہ اور باقی رہنے کی خواہش کرتے ہوئے نظر نہیں آتے حضرت موسیٰ کی بعثت کا ایک مقصد اللہ وحدہ لا شریک کی بندگی کی دعوت اور دوسرا مقصد بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکالنا تھا۔ پھر قرآن میں امت مسلمہ کے بارے میں فرمایا گیا۔

کنتم خیر امتکم اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر وتؤمنون باللہ (ال عمران ۱۱۰)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جیسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ خیر امت کا منصب اور معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا کیا معنی رکھتا ہے کیا یہ کام کوئی مقہور و مغلوب اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والا گروہ کر سکتا ہے؟ کیا یہ لقب مسلمانوں کو قائدانہ اور حاکمانہ مقام پر نہیں کھڑا کرتا؟ اسی طرح شہادت حق کی ذمہ داری دے کر شہداء علی الناس کے منصب پر فائز کرنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا شہادت اور قیادت قریب المعنی الفاظ نہیں ہیں؟ اور کیا یہ کام کوئی مرحوب اور مغلوب گروہ کر سکتا ہے۔

یا ایہا الذین امنوا کونوا قومین للہ شہداء بالقسط ولا

يَجْرُ مِنْكُمْ شَتَانِ قَوْمٍ عَلَىٰ لَا تَعْدِلُوا ۖ اَعْدِلُوا ۖ هَٰوَ اقْرَبُ لِلتَّقْوٰى
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْلَمُونَ (المائدہ: ۸)

ترجمہ۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی
گواہی دینے والے بنو کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشغول نہ کر دے کہ انصاف سے
پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسب رکھتا ہے اللہ سے ڈر کر کام کرتے
رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

عدل و قسط قائم کرنے کی ذمہ داری کیا یہ تقاضہ نہیں کرتی کہ پہلے ظالم اور
جابر لوگوں کے ہتھیار استبداد سے خود یہ گروہ آزاد ہو۔ جو ظالموں اور مفسدین کے زیر
اثر اور تابع ہو گا۔ وہ دنیا میں اپنے سے ظلم اور زیادتی کو دور نہیں کر سکتا وہ دوسرے
مظلوموں کی کیا دادرسی کرے گا۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ احساس شعور دلایا گیا
ہے کہ تم اقوام عالم میں اونچا مقام رکھتے ہو۔ اپنے کو کمتر نہ سمجھو۔

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا ۖ اِلَى السَّلٰمِ ... وَ اَنْتُمْ اِلٰى عَلٰوَن ... اللّٰهُ
مَعَكُمْ وَلَنْ يَتْرُكَ اَعْمَالَكُمْ (محمدہ: ۳۵)

پس تم ہودے نہ بنو اور صلاح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے
ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو احساس کمتری سے بچایا ہے اس لئے
کہ جس گروہ میں یہ مرفض پیدا ہو جائے گا وہ کسی میدان میں دوسروں سے آگے بڑھنے
کی بات تو دور کی ہے وہ غیروں کی ہم سری بھی نہیں کر سکتا۔ جو فوج میدان میں نہیں
ہو گئی۔ وہ میدان میں کیسے کھڑے رہ سکتی ہے اسی بناء پر سربراہوں کی پہلی کوشش
ہوتی ہے کہ وہ فوج کے حوصلے کو قائم رکھے۔ اور اگر حوصلہ باقی نہیں ہے تو سارے
ساز و سامان اور اسلحے بیکار ہو جائیں تعجب ہے ہمارے دانشوروں پر یہ نقطہ کیسے
پوشیدہ ہے ایک طرف محکوم اور مغلوب بن کر زندہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور

دوسری طرف یہ رونارہتے ہیں کہ مسلمان ہر میدان میں پچھے ہو رہے ہیں مرغوب اور محکوم ذہنیت کے لوگ پچھے نہیں تو آگے کیسے رہیں گے۔

ذیل کی آیت پر غور کیجئے کیا پیغام دے رہی ہے امت مسلمہ کے لئے کونسی منزل کا تحن کرتی ہے۔

قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون
ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب
حتی یعطوا الجزیۃ عن یدوہم صغیرین (التوبہ ۲۹)

جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر
ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں
کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور
چھوٹے بن کر رہیں۔

ان آیات پر ادنیٰ تاہل سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ مسلمان ملت کو جس
منصب پر فائز کیا گیا ہے اور اس کے ذمہ جو کام لگایا گیا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ
مسلمان اپنی قائدانہ حیثیت کو ہمیشہ اپنے ذہن و دماغ میں مستحضر رکھیں اور کسی
وقت بھی مغلوبیت، محکومیت اور تابعداری کی نفسیات میں مبتلا نہ ہوں ورنہ وہ نہ
عدل و قسط کی گواہی دے سکتے ہیں نہ ہزیمت اور پسپائی کی دلدل سے نکل سکتے ہیں اور
نہ کفار و مشرکین سے جزیہ وصول کرنے کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں بلکہ دوسروں کے
ہمیشہ باجگزار بن کر رہیں گے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے برادر محترم کو یہی
دوسری حالت زیادہ پسند ہے لیکن کیوں پسند ہے اس کا جواب ایک راز سرہستہ ہے
جس کو شاید وہ سمجھ رہے ہوں لیکن دوسروں کو سمجھا نہیں سکتے۔

پھر دیکھئے اللہ نے اپنے رسول کو کتاب دے کر بھیجا کس مقصد کے لئے کیا وہ
مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو کفر و شرک کی ظلمات سے نکال کر دین حق کی روشنی

میں لائیں اور ادیان باطلہ پر دین حق کو غالب کر دیں۔ سوچئے اللہ کے رسولؐ نے اس زمین پر کیا کارنامہ انجام دیا وہ کارنامہ اس کے ہوا کیا تھا کہ آپؐ نے خدا کے بندوں کو خدا کے سامنے جھکایا اور انسانی زندگی پر قرآنی نظام قائم کیا اور تمام غیر اللہ کی محبوبیت اور حاکمیت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے لئے آپؐ نے جہاں افہام وہ تفہیم اور دعوت و تبلیغ سے کام لیا وہیں (۸۰) اسی سے زیادہ مواقع پر آپؐ نے لشکر بھی ترتیب دیا۔ اور (۲۸) ٹھانسیں بار آپؐ بذات خود میدان جنگ میں آئے اور صرف کمان نہیں کی بلکہ کمان کے ساتھ ساتھ ایک سپاہی کی طرح لڑے اور زخم کھائے۔ آخر یہ سب کچھ کیوں ہوا اس کی آپؐ کیا توجہ کریں گے۔

آج اگر مسلمان اپنے نبیؐ کے اسوہ حسنہ کے مطابق دنیا کی قیادت و رہنمائی اپنا فریضہ سمجھتے ہیں اور اس منصب پر پہنچنے کی آرزو رکھتے ہیں اور اس کے لئے کچھ تنگ و دو کرتے ہیں تو وہ کیونکر قابل تنقید اور لائق ملامت ہیں لائق ملامت تو وہ ہیں جو وقت کے نمود، فرعون اور ابوہنبل کے سامنے سرنگوں ہو کر زندگی گزار لینے کو ہی حاصل زندگی اور کمال زندگی سمجھتے ہیں جو باطل نظریات اور ان کے علم برداروں کی واہ واہ کرتے ہیں لیکن حق کے علم برداروں پر اپنے تیر و نشتر چلانے کے لئے مستعد رہتے ہیں باطل کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لئے کھڑے ہونے کی ہمت نہیں کرتے۔ مسجد کے حق میں ایک لفظ بھی نہ بول کر مندر کے لئے فضا ہموار کرتے ہیں اہل حق کو چھوڑ کر باطل کے بجنٹوں کی تائید میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں۔ حسن البنا قطب شہید، مودودیؒ اور ابولحسن علی ندویؒ پر وار پر وار کرتے ہیں لیکن اردن شوریٰ، کلدیپ نیر اور اڈواتی کے لئے لپتے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور پوری ملت کو ان کے چرتوں میں گرنے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کرنے کے واسطے اپنی ساری صلاحیتوں کو لگانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

تھا جو نہ خوب بحدرتج وہی خوب ہوا
 کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر
 یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے بلکہ کھلی آنکھوں دیکھی جانے والی چیز ہے کہ اللہ کے
 نبی نے کسی کے تابع اور محکوم بن کر زندہ رہنا گوارا نہیں بلکہ زندگی اس انداز میں
 گزاری کہ لوگوں کو اپنی قیادت میں چلائیں اپنی بات منوائیں اور اپنے حکم کے سامنے
 لوگوں کو جھکائیں تو سوال یہ ہے کہ نبی کے جانشین اور نبی کے امتی اسوہ رسول کو
 چھوڑ کر دوسروں کے تابع اور محکوم کیسے بن کر رہیں گے؟ لیکن پھر بھی اگر کوئی
 مسلمانوں کو کسی کی تابعداری اور محکومیت قبول کرنے کی تلقین کرتا ہے تو اس کو
 اسوہ رسول سے کیا نسبت ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ہر شخص اپنے دل میں
 سوچ لے۔

صحابی رسول کا قول۔

اب آئیے ایک صحابی رسول کے قول پر ہم گفتگو کریں حضرت ربیع بن عامر کی
 بات سے خود یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اس وقت ایران میں اللہ کی عبادت کے بجائے
 انسانوں کی عبادت ہو رہی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ عبادت کیا تھی؟ اس سوال
 کے جواب میں دو باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسانوں کی عبادت سے مراد
 بتوں کی پوجا ہے تو اس صورت میں اگر عام انسانوں کو بت پرستی سے روکنے کے لیے
 حکمرانوں کو زیر کرنا ضروری ہو تو اس کے لیے جنگ کے سوا دوسرا راستہ کیا ہو سکتا
 ہے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جنگ دینی عمل اور مطلوب عمل ہوگی یا محض
 سیاسی اور نامطلوب عمل اس سوال کا جواب بالکل صاف ہے کہ لوگوں کو بتوں کی
 عبادت سے روکنے کے لیے جو کارروائی بھی کی جائے گی اس کو نامطلوب اور غیر دینی
 عمل نہیں کہا جاسکتا ورنہ ایران میں صحابہ کرام نے جو جنگ کی نعوذ باللہ وہ ایک

نامطلوب، سیاسی اور غیر دینی عمل ٹھہرے گا۔ دوسری بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ انسانوں کی عبادت سے مراد کچھ انسانوں کی قہاری اور جبہاری میں عام لوگوں کا غلام بن کر رہنا ہے تو اس صورت میں صاف ظاہر ہے کہ انسانوں کی عبادت سے اللہ کی عبادت کی طرف لانے کا مطلب لوگوں کو دین حق کے ماتحت کرنے کے سوا کیا ہوگا۔

تو سچی انسانیت کیا چیز ہے اور اس کا مفہوم کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت چونکہ برادر محترم نے نہیں کی ہے اس لیے ہم اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ البتہ ہم نے مانا کہ ایرانیوں سے جنگ ایک اضافی چیز تھی تو ایک اضافی عمل اگر صحابہ کرام سے ثابت ہے تو اس کے کرنے میں کیا قباحت ہے اور وہ کیوں بے سود ہے؟ اور وہ کیوں لائق ملامت ہے؟ لیکن جہاں تک جنگ کے اتفاقی ہونے کی بات ہے تو یہ بات بھی بالکل غلط اور ناقابل تسلیم ہے اس لیے کہ اتفاقی کہنا اس وقت صحیح ہوتا جب جاتے جاتے ناگہانی طور پر مڈ بھیر اور ٹکراؤ ہو جاتا ہے تو صورتحال یہ ہے کہ بالقصد صحابہ کرام گئے تھے اور پورے پلان کے ساتھ جا کر وہاں کہا تھا کہ ایسا ایسا کرو اور نہیں تو میدان میں آؤ آخر اس کو اتفاقی واقعہ کیونکر کہا جاسکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ اس طرح کے واقعات تاریخ اسلام میں مسلسل ملتے ہیں۔

ان پہلوؤں پر جو شخص بھی غور کریگا وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ برادر محترم ایک ایسی بات کہہ رہے ہیں جس کا کوئی سرپیر نہیں ہے اور جس کے لیے نہ کتاب و سنت سے کوئی دلیل مل سکتی ہے اور نہ تاریخ اسلامی سے۔ بس ایک مفروضہ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے زور قلم دکھایا جا رہا ہے اس موقع پر برادر محترم کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں عمومی مساوات، اخوت و محبت اور انسانیت کی ٹھنڈی ہوائیں چلانا ایک اضافی عمل ہے اور اصل مقصود کا لازمی نتیجہ ہے اصل مقصود تو حید ربوبیت اور توحید الہ ہے جس کو کسی حال میں نہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ پس پشت ڈالا جاسکتا ہے یعنی اخوت و محبت کے لیے توحید کو نہیں چھوڑا جاسکتا جیسا کہ

انبیاء علیہم السلام کی ہجرت کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے اس کے برخلاف اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی کہ کسی نبی نے اخوت و محبت اور قومی یکجہتی کے حصول کے واسطے توحید اور توحید کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا یا اس سلسلے میں کسی مصالحت، مداخلت اور نرمی سے کام لیا ہو۔

بعض مواقع پر برادر محترم نے اضافی اور مقصود کی دو تقسیمیں کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ لوگ سطح پر ہیں اور میں بہت گہرائی میں پہنچا ہوا ہوں مثلاً موصوف انابت اور توکل کو مقصود اور دوسری چیزوں کو اضافی یعنی غیر مقصود کہتے ہیں حالانکہ بعض انہیں باتوں کا نہ ہونا عدم لیمان قرار دیا جاتا ہے جیسے جہاد میں شرکت نہ کرنا، اللہ رسول کے فیصلے کو نہ ماننا، اور طاغوت کے پاس اپنا مقدمہ لے جانا وغیرہ اس چیز کو ایک اور پہلو سے دیکھئے اسی طرح کی ذہنیت کی بناء پر کئی لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو بھی اضافی قرار دیکر دل کی نماز پڑھتے ہیں حتیٰ کہ جمعہ کی نماز میں بھی شرکت نہیں کرتے کہ اصل مقصود تو اللہ سے تعلق ہے اس کو دل کی آنکھوں سے دیکھنا ہے اور اس کا وصال حاصل کرنا ہے وغیرہ ذلک۔ اس اعتبار سے اضافی اور غیر اضافی کی تقسیم ایک گمراہ کن تقسیم ہے کیونکہ اصل چیز رضائے الہی کے حصول کے لیے سنت رسول کے مطابق جہد و عمل ہے۔

گڈ مسلم اور گڈ انڈین

برادر محترم بڑے دعوے کے ساتھ لکھتے ہیں۔

(غیر مسلموں کی طرف سے یہ مسئلہ بار بار مختلف صورتوں میں اٹھایا گیا ہے۔ انگلش میگزین سنڈے (۱۹-۲۵ نومبر ۱۹۹۵) میں مسٹر ارن شوری کا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ایک شخص اگر گڈ مسلم ہے تو وہ گڈ انڈین (یا گڈ فرنچ،

گڈ جرم (نہیں ہو سکتا۔

۲۸ نومبر ۱۹۹۵ کو میں نے یہ انٹرویو پڑھا۔ اس کے فوراً بعد میں نے مسٹر اردن شوری کو ٹیلی فون کیا۔ میں نے کہا کہ یہ کیسی بات آپ نے کہہ دی۔ آپ کی تعریف کے مطابق، میں گڈ مسلم ہوں مگر اسی کے ساتھ میں ایک گڈ انڈین بھی ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر میں گڈ انڈین نہیں ہوں تو سارے ملک میں کوئی بھی شخص گڈ انڈین نہیں۔ حتیٰ کہ میں کہوں گا کہ اگر کوئی شخص مجھ کو گڈ انڈین نہ مانے تو اس کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مہاتما گاندھی بھی گڈ انڈین نہیں تھے۔

مسٹر اردن شوری نے فوراً اس کی تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ میں تو آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ آپ پورے معنوں میں ایک گڈ انڈین ہیں۔ میں نے اپنے انٹرویو میں آپ کا نام لے کر آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ مگر میگزین والوں نے میرا پورا انٹرویو نہیں چھاپا۔

مگر سوال کسی ایک فرد کے گڈ انڈین ہونے کا نہیں ہے بلکہ اصول کا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ایک شخص اچھا مسلمان ہوتے ہوئے کیا اچھا انڈین یا اچھا فرینچ بن سکتا ہے یا نہیں (صفحہ ۱۸)

یہاں ذرا بھی معروضی انداز سے جو سوچے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اردن شوری صحیح ہے اور ہمارے برادر محترم غلط ہیں ہم برادر محترم سے سوال کریں گے کہ فرض کیجئے دستور ہند کی روشنی میں ملک کی عدالت عالیہ سپریم کورٹ یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا فیصلہ کر دے، یا قرآن پر بین لگادے یا انڈین فوج اسرائیل سے ملکر مکہ و مدینہ پر حملہ کر دے تو ظاہر ہے ایک گڈ مسلم اور ایک گڈ انڈین دونوں کا فرض

اور رول ایک نہیں ہوگا۔ ایک گڈ مسلم ان تینوں فیصلوں کے خلاف جائے گا اور ایک گڈ انڈین ان تینوں کی تائید کرے گا۔

آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ دو متضاد چیزیں معمول کے حالات میں ایک ساتھ چلتی ہیں اس کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جانا چاہیے کہ یہ متضاد نہیں ہیں۔ متضاد تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ کسی وقت یہ دونوں کی راہ الگ الگ ہو سکتی ہے۔ حقیقت پسندی کا یہی تقاضا ہے۔

ارون ثوری کے خیال میں گڈ انڈین وہ ہوگا جو وطن پرست ہو۔ لیکن ایک گڈ مسلم وطن دوست ہوگا۔ وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی اپنے وطنوں سے ہجرت اس کے لیے شاہد عدل ہیں۔

عالمی قومیت:-

برادر محترم تحریر کرتے ہیں:-

۱۹ ویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں سیاسی ضرورت کے تحت نہ کہ شرعی تقاضے کے تحت ساری مسلم دنیا میں ایسی تحریکیں اٹھیں جنہوں نے مسلمانوں کو یہ ذہن دیا کہ اسلام ایک عالمی قومیت ہے اور مسلمان اس عالمی قومیت کے بین الاقوامی شہری ہیں پان اسلام ازم، خلافت تحریک، عالمی حکومت الہیہ، خدام کعبہ، الاخوان المسلمون، تحریک پاکستان وغیرہ سب نے کسی نہ کسی اعتبار سے مسلمانوں کے اندر اسی قسم کا ذہن بنایا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا ذہن آج شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی ہے۔

فکری اسلامی:-

شرعی تقاضے اور سیاسی ضرورت میں کیا کوئی ایسا تضاد ہے کہ یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ایک ہی چیز سیاسی ضرورت بھی ہو سکتی اور شرعی تقاضا

بھی، مثلاً کسی مقام پر مسجد کو مسجد مقرر کرنے کے لئے کچھ لوگ جمع ہو جائیں تو شرعی تقاضا ہوگا کہ مسجد کے تحفظ کے لئے کمر بستہ ہو جائے اور سیاسی ضرورت بھی کہ اگر اس موقع پر ہم چپکے بیٹھے رہیں گے تو دوسری اور تعمیری مسجد بھی گرا دینے کی ہمت ہو جائے گی۔ کسی مسجد میں نماز سے روکا جا رہا ہو تو شرعی تقاضا بھی ہے اور سیاسی ضرورت بھی کہ حتی المقدور نماز پڑھنے کی کوشش کی جائے ورنہ ہماری کمزوری سے مخالفین کی ہمت مزید بڑھ جائے گی۔ پھر کیا سیاسی ضرورت کو شرعی تقاضا نہیں بول سکتے۔ طواف کعبہ میں رمل کی سنت کو آپ شرعی تقاضہ کہیں گے یا سیاسی ضرورت؟ دشمن کے نقل و حرکت کی خبر پا کر آپ فوجی دستہ ”سریہ“ روانہ کرتے تھے اس کو آپ کس خانہ میں رکھیں گے۔ دشمن کے تعاقب میں سستی نہ کرو۔ اسی طرح جہاد و قتال کے احکام نیز شریعت اسلامی میں حدود و تعزیرات کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں وہ شرعی تقاضے ہیں یا سیاسی ضرورت، الفرض زندگی میں بہت مواقع پر سیاسی ضرورت کو یوراکرنا شرعی تقاضا ہوتا ہے اس لئے سیاسی ضرورت کا نام دے کر کسی بات کی اہمیت کو کم نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک عالمی اخوت کا ذہن اور تصور ہے وہ انیسویں اور بیسویں صدی کا ذہن نہیں ہے بلکہ یہ ذہن اسی دن پیدا کر دیا جاتا ہے جس دن آدمی کلمہ پڑھتا ہے۔ قرآنی آیت پر غور کیجئے۔

انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ
لعلمکم ترحمون (سورۃ الحجرات)

مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی قرار دیا گیا ہے۔ کیا اس میں کوئی استثناء ہے یا کوئی قید لگی ہے۔ کہ صرف ہندی مسلمان بھائی بھائی ہیں پاکستانی اور ایرانی اس

برادری سے خارج ہیں یا صرف عرب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور دوسرے ملکوں کے مسلمان الگ ہیں ظاہر ہے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بتایا ہے۔ کیا عالمی قومیت نہیں ہے؟

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سب کے سب جسد واحد کے مانند ہیں۔ جس طرح جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ ایسے ہی ایک مسلمان کی تکلیف کو دوسرے مسلمان محسوس کریں۔ خواہ ان میں کا ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں۔ معلوم ہوا کہ ملت اسلامیہ کی وحدت دریا سہاڑ اور مختلف ملکوں کی سرحدیں نہیں ختم کر سکتیں اور اگر ان وجوہ سے کوئی ملت اسلامیہ میں تفریق کرتا ہے تو وہ شرعی اور اسلامی لحاظ سے ناقابل اعتبار اور غلط ہے۔ اسلام ایک عالمی قومیت ہے اس نظریہ سے اگر آج نظریات تکرار ہے ہیں تو کیسے ضروری ہو گیا کہ اپنے نظریہ چھوڑ کر موجودہ نظریات کو قبول کر لیا جائے۔ سیدھی سی بات ہے قومیت کے بہت سارے نظریات ہو سکتے ہیں لیکن ایک مسلمان کے لئے صحیح طرز عمل یہ ہوگا کہ جہاں تک اسلام کے عالمی اخوت سے ٹکراو نہ ہو وہاں تک ان کا بھی لحاظ کرے۔ اور جہاں یہ سوال پیدا ہو جائے کہ آپ وطنی قومیت میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا اسلامی قومیت میں تو آدمی اسلامی قومیت میں شامل رہنے کی بات کہے۔ الفرض وطنی قومیت کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بشرطیکہ اسلام کی عالمی قومیت کی نفی نہ ہو۔ جو کوئی ملت اسلامیہ کو ایرانی۔ تورانی اور افغانی کے خانوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے اس کو اپنے قلب و نظر کے سارے گوشوں پر خود ناقدانہ نظر ڈالکر جائزہ لینا چاہئے کیونکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آپ جن کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں ان کی ہر بات کو لازماً لائق ملامت ٹھرائیں۔

سیاست کی اہمیت :-

(قدیم زمانہ کے حالات میں صرف پولیٹیکل ایمپائر ہی اصل اہمیت رکھتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں نے عالمی سطح پر اپنا ایک پولیٹیکل ایمپائر بنایا مگر موجودہ زمانہ میں سیاست اور حکومت کی حیثیت ثانوی ہو گئی۔ اب دوسری غیر سیاسی چیزوں نے اہمیت اختیار کر لی ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے مصلحین اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے فائدہ طور پر سیاست کی چٹان پر اپنا سر ٹکراتے رہے۔ جب کہ عین اسی وقت ان کے لئے دوسرے مواقع کو استعمال کر کے دوبارہ زیادہ طاقت ور انداز میں دعوہ ایمپائر بنانے کا امکان پوری طرح کھلا ہوا تھا) (صفحہ ۲۷-۲۸) یہ ماضی اور حال دونوں کا ناقص ہی نہیں سراسر غلط مطالعہ ہے اس لئے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں سے سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا شعبہ سیاسی شعبہ ہے۔ سیاست اور حکومت جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اسی کی بالادستی ہر شعبہ زندگی میں ہوتی ہے اور اسی کو غالب کہا جاتا ہے اور بقیہ لوگ مغلوب اور محکوم ہوتے ہیں۔ کیا یہ کوئی سوچ سکتا ہے کہ سیاسی بالادستی کے بغیر کسی ملک میں سوشلزم کیونزم یا کسی دوسرے نظام کو قائم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سیاسی غلبہ کے بغیر ملک میں سودی نظام کے بغیر اسلام کا معاشی نظام جاری کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کیونیکشن کے جدید ذرائع داعی حق کیسے استعمال کر سکتا ہے؟ جبکہ شیطان کے ایجنٹوں کے ہاتھ میں سیاست اور حکومت کی باگ ڈور ہے۔ انڈسٹری کو آزاد کہا جاتا ہے لیکن کیا جائز اور حلال دائرے میں رہ کر کوئی اس میدان میں کوئی بڑی کامیابی حاصل کر سکتا ہے؟ سیاسی ادارہ کے بغیر ایسی یونیورسٹیاں کیسے بنائی جاسکتی ہیں؟ جو ساری دنیا کے لئے علوم الہی کا سرچشمہ بن جائیں۔ ایسے ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی اسٹیشن کیسے قائم کئے جاسکتے ہیں؟ جہاں سے بیک وقت اہل عالم کو خطاب کیا جائے ایسا اقتصادی ہوز کیسے

بنایا جاسکتا ہے۔ جہاں سے تمام اسلامی سرگرمیوں کو اپنی بنیاد پر جاری کیا جاسکے۔ جدید طرز کے اسپتال، جدید طرز کے رہائشی ادارے، معذور افراد کیلئے جدید معیار کی سہولتیں اور اس قسم کے دوسرے کام کسی حکومت کے اشتراک اور تعاون کے بغیر اعلیٰ ترین سطح پر کیے کئے جاسکتے ہیں؟ یہ باتیں تو دور کی ہیں آپ ایک "الرسالہ" اور چند کتابیں بھی شائع نہیں کر سکتے۔ اگر کسی صاحب اقتدار کی نوازش نہ ہو۔

معیار صحیح و غلط:-

لاورنگ زیب عالمگیر نے مختلف طاقتوں سے ٹکرا دیا تو اس کے سامنے اسلام کا صرف یہ حکم تھا کہ اسلام دشمن طاقتوں کو زیر کر دے۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی نے مرہٹوں کے خلاف جہاد کی اسکیم بنائی۔ سید احمد شہید بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔ علماء دیوبند نے انگریزوں سے جہاد بالسیف کیا۔ اس طرح کے تمام واقعات اسلام کے حکم دشمنوں سے مقابلہ کر دے مستحیط کئے گئے تھے۔

اسی طرح اقبال کا عہدہ مسلم اسٹیٹ کا نظریہ اور تقسیم کے بعد اٹھنے والی مسلم پرسنل لا تحریک، بامری مسجد تحریک اس قسم کی تمام تحریکیں تحفظ شریعت کے حکم سے اخذ کی گئی تھی مگر موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کے احیاء کے لئے اس کلی اجتہاد کی ضرورت تھی جو مجموعی مصالح شرعی کی بنیاد پر وضع کیا جائے۔ مگر تمام مصلحین صرف جزئی استنباط کی حد تک پہنچ سکے۔ وہ شریعت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر کلی استنباط یا کلی اجتہاد کا ثبوت نہ دے سکے، اس لئے نہ ان کا استنباط مطابق حال تھا اور نہ وہ کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنا۔ ۲۵۴-۲۶

یہاں برادر محترم کو جو چیز بتانی چاہئے تھی اس سے پہلو بچا کر نکل گئے بتانا یہ تھا کہ اورنگ زیب عالمگیر، شاہ ولی اللہ دہلوی، سید احمد شہید، اور علماء دیوبند نے اسلام کے حکم "دشمنوں سے مقابلہ کر دے" سے مستحیط کیا اس میں غلطی کیا ہے، غلطی تو

اس وقت ہوتی جب وہ غیر اسلام کے کسی حکم سے استنباط کئے ہوتے۔ دوسری بات یہ
 ہیکہ ان بزرگوں نے استنباط نہیں کیا۔ استنباط کرنے کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جہاں
 کوئی حکم موجود نہ ہو۔ وہاں تو دشمنوں سے لڑنے کا صریح حکم موجود تھا اور ہے۔ ان
 بزرگوں نے اس پر صرف عمل کیا۔ اگر یہ غلطی ہے تو واقعی انہوں نے غلط کیا۔ اسی
 طرح تحفظ شریعت کا حکم بھی موجود ہے جس کا آں محترم کو اعتراض ہے دراصل بات
 یہ ہیکہ بزرگان دین اور برادر محترم کے نقطہ نظر میں فرق یہ ہیکہ کتاب کے نزدیک
 صحیح اور غلط کا معیار دنیاوی فائدہ کے اعتبار سے کسی نتیجہ کا حاصل ہونا ہے جبکہ
 بزرگان دین کے نزدیک معیار اور کوئی کتاب و سنت کے مطابق ہونا ہے خواہ دنیا
 میں اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو اسی چیز کا نام استقامت ہے۔ پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ
 انگریز ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور کسی ایک واقعہ یا کسی ایک شخصیت کے ڈر سے
 نہیں ہوا۔ جیسا کہ برادر محترم کا خیال ہے کہ گاندھی جی کے اجتہاد نے انگریز کو بھگایا
 نہیں انگریز کے جانے کا اصل سبب وہ جہد مسلسل ہے جس کی آخری علامت علماء دیوبند
 کی قربانیاں ہیں جہاد مسلسل کا تسلسل اگر نہیں ہوتا تو یہ منزل ہرگز نہیں آتی کہ
 انگریز ہندوستان کو گاندھی جی اور مسٹر جناح کے حوالے کر دیتے۔

اسلام کا اصل مقصد:-

۱) اسلام کا اصل مقصد دل کی دنیا کو بدلنا ہے نہ کہ ظاہری ڈھانچہ کو بدلنا،
 اسلام کا اصل مقصد اظہار ہے، اسلام کا اصل مقصد اقتدار نہیں۔ اسلام کا منشا نہ
 نظریاتی غلبہ ہے نہ کہ محض سیاسی غلبہ۔ اسلام کا اصل مقصد جنت ہے، اسلام کا اصل
 مقصد حکومت نہیں۔ صفحہ ۲۹

یہاں کھلے طور پر برادر محترم کی ذہنی بیماری ظاہر ہو رہی ہے اسلام کا مقصد
 دل کا بدلنا بھی ہے اور ہاتھ پیر اور پورے اعضاء و جوارح کو بدلنا بھی ہے اسلام ایک

مکمل دین ہے اس کا مقصد مکمل تبدیلی ہے وہ پوری زندگی کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے انسانی زندگی کا نجی شعبہ ہو یا خاندانی، معاشرتی ہو کہ سیاسی سب پر اسلام اللہ اور رسول کی حکمرانی چاہتا ہے ہر جگہ سے منکرات اور منکرات کے بجنٹوں کو نکالنا چاہتا ہے آپ سے کس نے کہا کہ اصل مقصود حکومت ہے مقصود حکومت نہیں ہے۔ لیکن اصل مقصود کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے وضو مقصود نہیں ہے لیکن وضو کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی اسی لئے وضو فرض ہے۔ معرکہ بدر و حنین مقصود نہیں تھے لیکن فتح مکہ کے لئے ضروری تھے پھر فتح مکہ بھی مقصود نہیں تھا مگر تطہیر کعبہ کے لئے فتح مکہ لازمی تھا۔ نیز تطہیر کعبہ بھی مقصود نہیں لیکن رضاء الہی کیلئے کعبہ کو پاک کرنا لازمی تھا۔

جو گیوں، راہبوں اور سادھوؤں کی طرح اگر صرف دلگی دنیا ہی بدلنی ہوتی تو تاریخ دعوت و عزیمت بار بار دہرانے کی ضرورت نہ پڑتی اور اللہ کے پیارے نبی غار حرا سے نہ نکلتے، مکہ میں قریش کی گالیاں نہ کھاتے، طائف میں پتھر کھانے کی نوبت نہ آتی اور بدر و حنین کے معرکوں میں شریک نہ ہو کر دنیا کا لطف اٹھاتے۔

برادر محترم! اپنے اسی ذہنی مرض کے بنا پر ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں "اب اگر کسی مقام پر اہل اسلام کو حکومتی ادارے میں غلبہ حاصل نہیں ہے تو اس پر انہیں کچھ ملال کرنے کی ضرورت نہیں" گویا آپ محترم کہنا چاہتے ہیں کہ اگر مسلمان ذلت اور پستی کی حالت میں ہوں خدا اور رسول کی تعلیمات کے بجائے طواغیت انس و جن اپنی خرافات پھیلا رہے ہوں، قرآن و سنت پر مبنی احکام و قوانین کے بجائے کفر و شرک و زندقہ والحاد کا دور دورہ ہو تو مسلمانوں کو کسی طرح کا ملال نہیں کرنا چاہئے۔ کیا سوچ ہے اللہ رے توبہ! شیطان کا بڑے سے بڑا بجنٹ بھی کیا اس دھڑلے سے اس طرح کی نصیحت مسلمانوں کو کرنے کی جرات کرے گا؟

یہ کیا ذہنیت ہے!:-

برادر محترم تحریر کرتے ہیں پروفیسر مشیر الحق یکم اگست 1933ء کو یوپی کے ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے ۱۵/ اپریل 1990ء کو انہیں سری نگر میں شہید کر دیا گیا۔ گا ہمیں پروفیسر مشیر الحق کو شہید کہنے پر کوئی اعتراض نہیں اللہ ان کی شہادت کو قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔ لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ کشمیر میں اپنی آزادی کیلئے لڑنے اور مرنے والوں کو دہشت پسند کا لقب دیا جاتا ہے اور سید احمد بریلوی کے ساتھیوں کے لئے ہلاکت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے؟ آخر یہ کیا ذہنیت ہے؟ چنانچہ فرماتے ہیں لایہ فتویٰ جاری رہا یہاں تک کہ 1831ء میں سید احمد بریلوی نے اپنے ساتھیوں کو لے کر عملی جہاد کیا جس میں تمام کے تمام لوگ ہلاک ہو گئے گا (صفحہ ۳۰)

اقوام متحدہ:-

اعلاء اپنی غیر مجتہدانہ سوچ کے تحت صرف ایک اختیار کو جانتے تھے۔ اور وہ تشدد کا اختیار تھا۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ ان کی جدوجہد آزادی کے لئے موجودہ زمانہ میں ایک عظیم تر نظریاتی اختیار وجود میں آچکا ہے۔ یہ اختیار وہ ہے جس کو حکومت خود اختیاری (Self - Determination) کہا جاتا ہے۔ یہ تصور اٹھارویں صدی کے فریج ریولوشن کے دوران ظہور میں آچکا تھا۔ جس نے قوموں کو یہ حق دیا کہ وہ تشدد کا استعمال کئے بغیر محض دلیل کی پراسن طاقت سے قومی آزادی کی موثر جدوجہد کر سکیں۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد 1919ء میں بننے والی حمیتہ اقوام League of Nations کے متعلق مسلمانوں کے رہنما علامہ اقبال صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ کفن چوروں کی انجمن ہے جو تہذیبوں کی تقسیم کے لئے مظہم کی گئی ہے:

جمیعت اقوام کلن دزدے چند
بہر تقسیم قبور را انجمنے ساختہ اند

مگر اصل حقیقت ہے کہ جمیعت اقوام نے پہلی بار انٹرنیشنل تصدیق سے یہ سیاسی معیار طے کیا کہ ہر قوم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے درمیان اپنی مرضی کی حکومت قائم کرے۔ پھر دوسری عالمی جنگ کے بعد 1945ء میں جب اقوام متحدہ (United Nations) بنائی گئی تو تمام قوموں کے اتفاق رائے سے یہ اصول آخری طور پر ایک مصدقہ سیاسی اصولوں کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ (۱۸/۴۱)

مہاتما گاندھی نے عالمی سیاست کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ ان زمانی تبدیلیوں سے آگاہ تھے چنانچہ وہ ساؤتھ آفریقہ سے ہندوستان آئے اور اپنے "سیکولر اتحاد کے ذریعہ ہندوستان کے عوام میں علماء کو بتایا کہ ہمیں اب تشددانہ ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں" حکومت خود اختیاری کے نظریاتی ہتھیار کو ہم زیادہ موثر طور پر اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں چنانچہ علماء کی مقلدانہ رائے پر گاندھی جی کی بمطہدانہ رائے برتر ثابت ہوئی اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ اب تمام لوگوں کے لئے ایک معلوم تاریخ بن چکا ہے (صفحہ ۴۱-۴۲)

مزکورہ بالا لمبا اقتباس پڑھنے کے بعد مندرجہ ذیل باتوں پر غور کیجئے۔

- ۱۔ "حکومت خود اختیاری کا ہتھیار وجود میں آنے کے بعد ایسا کیوں نہیں ہوا کہ تمام ممالک نے اپنی فوجوں کو ختم کر دیا ہو بلاوجہ ہر ملک اپنی قومی دولت کا ایک بڑا حصہ فوجوں اور ہتھیاروں پر خرچ کرتا ہے اسی طرح یہ کیوں نہیں ہوا کہ دنیا کی نظریاتی، طبقاتی و طنی اور مذہبی گروہوں نے اپنی جدوجہد اور جنگ و دور دک دی ہو۔
- ۲۔ جمیعت اقوام ہو یا اقوام متحدہ ہوا ان کے اصولوں نے دنیا کے کتنے مسائل حل کئے ہیں اور کتنے کمزوروں کو انھوں نے ان کا حق دلا یا ہے۔

۳۔ کوئی ایسی مثال دیجئے کہ جس کے پاس قوت مدافعت نہیں تھی لیکن اقوام

متحدہ کے اصولوں نے اس کا حق دلایا ہو۔ افغانستان سے حملہ آور روس کو قوت نے بھگایا یا دلیل نے ؟ اس کے بعد یوسنیا، چیچنیا کو جو آزادی بھی ملی ہے کیا دلیل کی بنیاد پر ملی ہے ؟ افغانستان سے شکست کھا کر روس کے ٹوٹنے سے پہلے اقوام متحدہ کے اصول اور دلائل کہاں تھے ؟ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا بیجا نہیں ہوگا کہ برادر محترم کی یا تو یہ سادہ لوحی ہے یا پھر کسی اسلام دشمن قوت کے شکار ہو گئے ہیں کہ اس طرح کی بے سروپیر کی باتیں مسلمانوں کے ذہنوں میں پھٹانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ذرا بھی آگے پچھے نہیں سوچ رہے ہیں اور اس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاعیات۔

۴۔ قرآن خدا کی آخری کتاب ہے قرآن میں قوت اور طاقت استعمال کرنے کی بار بار تاکید آئی ہے باطل اور اہل باطل کو دبانے یا مٹانے کے لئے۔ کیا اس طرح کے احکام اقوام متحدہ کے وجود میں آنے کے بعد کالعدم ہو گئے ہیں اور ”قاتلو احتی لا تکنون فتنۃ“ اور ”اعداء الہم ما استطعتم من قوتہ و من رباط الخیل“

جیسی آیات منسوخ ہو گئی ہیں ؟ اور کیا اب مسلمان خیر امت کے لقب کو، اس کے مقتضیات کو اور دانتہم الاعلون کے تصور کو اپنے ذہن و دماغ سے کھرچ کر نکال دیں اور ہاتھ پیر توڑ کر بس بیٹھ جائیں کہ اب اقوام متحدہ کی امن چارٹ کے وجود میں آنے کے بعد کسی عملی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے۔

امام اور قائد کی حیثیت:

۱۸ ویں صدی میں جب مغربی قوتیں نئی طاقت سے مسلح ہو کر ابھریں اور انھوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو مغلوب کر لیا تو تمام دنیا کے مسلم دانشور نحن خلفاء اللہ فی الارض (ہم زمین پر خدا کے خلیفہ ہیں) کے اسی تصور میں سرشار تھے۔ وہ اپنی صرف

ایک شناخت جانتے تھے، اور وہ یہ کہ وہ زمین پر امام اور قائد کی حیثیت سے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ صورت حال آج تک پوری طرح باقی ہے ایک شاعر کے الفاظ میں، اس فکر کا خلاصہ یہ ہے:

جس طرح احمد مختار ہیں نبیوں میں امام

ان کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

اس ذہن کی بنیاد پر مسلم علماء اور دانشوروں کو کرنے کا ایک ہی کام نظر آیا۔ یہ کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی حاکمانہ حیثیت کو دوبارہ حاصل کریں۔ پچھلے تقریباً دو سو سال سے کسی نہ کسی صورت میں یہ جدوجہد جاری ہے۔ مگر ان گنت قربانیوں کے باوجود اس میدان میں مسلمان اب تک کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔ (صفحہ ۴۴)

یہ کہنا بالکل صحیح نہیں ہے کہ مسلمان اب تک کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے اندازہ کیجئے اگر مسلمانوں نے ان گنت قربانیاں نہ دی ہوتیں اور آں محترم کے نظریہ کے مطابق بالکل سرنگوں ہو گئے ہوتے۔ اور مخالف قوتوں کے مقابلہ میں سپردال دی ہوتی تو آج ان کے زوال اور پستی کی کیا انتہا ہوتی اس کا تصور کیجئے۔ آج ان کی جو بھی بچی بچی ساکھ ہے انھیں قربانیوں کے صلہ میں باقی ہے اسی طرح مسلمانوں کے اندر لپٹے امام اور قائد ہونے کے بجائے دوسروں کا خوشہ چیں، دوسری قوموں کا مقتدری اور دوسرے لیڈروں کے پیروکار بن جانے کا تصور عام ہو جاتا، اور احساس کمتری اور ہمسائیگی کا شکار ہو گئے ہوتے تو اس وقت ان کا کیا حال ہوتا۔

جہاں تک دعوت کا سوال ہے تو دعوت کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ داعی اپنی دعوت اور پیغام کو سارے نظریات اور عقائد سے اونچا اور لائق سمجھے اور دوسرے سارے نظریات کو غلط، بے بنیاد اور انسانیت کے لئے مہلک اور خسارے کا باعث جانتے اسی کے ساتھ اہل حق کو اہل باطل کے مقابلے میں اہمیت اور عزت و اکرام کے لائق تصور کرے مگر یہ دو چیزیں کسی کے اندر نہیں ہونگی تو وہ کیا دعوت دے گا اور

کس چیز کی دعوت دے گا۔ انبیاء علیہم السلام اللہ کی بندگی اور اپنی اطاعت کی دعوت دیتے تھے اگر وہ صرف اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے اور اپنی اطاعت کرانے کی بجائے باطل عقائد کے پیشواؤں اور لیڈروں کے مقتدی اور پیروکار رہنے دیتے تو ان کی دعوت کا کون نوٹس لیتا۔ نیکی اور بدی، صالح اور غیر صالح کے امتیاز اور فرق کا کہاں منظر سامنے آتا نہیں معلوم کس دلیل اور کس محرک کے تحت برادر محترم کو سب سے زیادہ جو چیز ناپسندیدہ اور غلط معلوم ہوتی ہے وہ مسلمانوں کے ذہن میں اپنے امام اور قائد ہونے کا تصور ہے اسی لئے خلیفہ خلافت اور لفظ شہداء کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو سلف صالحین کی راہ سے ہٹی ہوئی ہوتیں ہیں چنانچہ دیکھئے شہداء کے مفہوم میں یقیناً حق کی شہادت کا مفہوم شامل ہے لیکن غور فرمائے کہ کیا شہادت کا حق صرف قولی شہادت، وعظ و تلقین اور کتابیں تصنیف و تقسیم کرنے سے ادا ہو جائے گا؟ اور قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت کی ضرورت نہیں ہے یقیناً اس سوال کا جواب اس بات میں ہو گا تو ظاہر ہے کہ عملی شہادت میں عبادات، اخلاقیات اسلام کے معاشرتی، خاندانی اور سیاسی اصول کی شہادت بھی ضروری ٹھرے گی۔ ہمیں سے خلافت کے تصور کا آغاز ہوتا ہے چنانچہ یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب تک نظام خلافت قائم نہیں ہوتا اس وقت تک دعوت اور شہادت حق پوری طرح ادا کرنا ناممکن ہے۔ اسی لئے فقہائے کرام کہتے ہیں کہ نصب امام یعنی حکومت اسلامیہ کا قیام ایک دینی فریضہ ہے

فقہ کی رہنمائی:

اس معاملہ کو مثال سے سمجھئے۔ موجودہ فقہ خلافت عباسی کے زمانے میں بنی اس وقت مسلمانوں کو زمین پر کلی اقتدار حاصل تھا۔ چنانچہ یہ مدون فقہ یہ تو بتاتی ہے کہ مسلمان جب حکمران حیثیت میں ہوں تو ان کے لئے شرعی احکام کیا ہیں۔ اس میں

ایسے ابواب کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان جب اپنے آپ کو غیر حکمران حیثیت میں پائیں، اس وقت ان کے لئے شرعی حکم کیا ہے۔ تو اس کا واضح جواب آپ کو موجودہ مدون فقہ میں نہیں ملے گا۔

اسی طرح موجودہ فقہ جس وقت مدون کی گئی اس وقت شخصی حاکمیت کا زمانہ تھا۔ موجودہ قسم کی عوامی جمہوریت اس وقت قائم نہیں ہوئی تھی، اس لئے فقہ میں خلیفہ اور سلطان سے متعلق احکام تو بہت ملیں گے۔ لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان کسی ملک میں تنہا حاکم نہ ہوں، البتہ وہ جمہوری نظام کے تحت دوسری قوموں کے ساتھ شریک حکومت ہوں، ایسی حالت میں ان کے لئے شرعی احکام کیا ہیں تو اس کی بابت بھی موجودہ مدون فقہ میں آپ کو کوئی رہنمائی نہیں پائیں گے۔" (صفحہ

۱۵۰-۲۹)

برادر محترم کو یہ شکوک ہے کہ فقہ میں آداب غلامی نہیں سکھائے گئے ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان حاکم ہوں تو کیا کریں لیکن جب محکوم اور غلام ہوں تو کیا کریں نہیں بتایا گیا۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ مسلمان غلام اور محکوم بن کر رہنے کے لئے نہیں آیا ہے مسلمان امت زمین پر اللہ کی نمائندہ ہے، رسول کی جانشین ہے اسے دنیا کی رہنمائی اور قیادت کے منصب پر فائز کیا گیا ہے اسے خیر امت کا لقب دے کر نیکیوں کا محافظ، بدیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے شیطان کے مقابلے میں اللہ کا وہ سپاہی ہے اسے حرب اللہ کہا گیا ہے اور حرب اللہ کی صفت شیطان کے مقابلے میں اللہ کے لئے لڑنا بتایا گیا ہے ایسی صورت میں کیسے ممکن تھا کہ اسے اچھا غلام بننے اور سچا وفادار اور کسی کا محکوم بننے کی تعلیم دی جاتی۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق

حلقہ شوق میں وہ جرأت اندیش کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق

خود بدلے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقہان حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

دوسری بات یہ ہے کہ کیا فقہ میں دشمنان اسلام سے جہاد فرض نہیں قرار دیا گیا ہے ؟ کیا فقہ کی کتابوں میں "کتاب الجہاد" آپ نے نہیں پڑھی ہے دار الحرب میں بحیثیت مستامن یا بحیثیت تاجر بحیثیت قیدی جائے تو وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں۔ اس طرح کے مسائل پر آپ کی نظر کیوں نہیں پڑتی۔ تیسری بات یہ ہے کہ آپ کے انداز گفتگو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب و سنت میں آداب غلامی اور آداب محکومی کی تعلیم ضرور دی گئی ہے لیکن فقہ میں وہ درج نہیں ہے اگر ایسی بات ہے تو براہ کرم آپ کو کم از کم دو چار آداب تو ضرور پیش کرنے چاہئے تھے قرآن کی یہ چند آیات پڑھئے اور بتائے کہ ان آیات کے ہوتے ہوئے ایک مسلمان کسی غیر کا کس طرح تابع اور محکوم بن کر رہ سکتا ہے (سورہ الانعام ۱۱۶) الکھف ۲۸۔ الفرقان ۵۲۔ الاحزاب ۴۸۔ القلم ۸۔ النساء ۲۴۔ ال عمران ۳۰۔ الشعراء ۱۵۱۔ محمد ۲۶۔) چوتھی بات یہ ہے کہ کسی جمہوری نظام کے تحت دوسری قوموں کے ساتھ مسلمان شریک حکومت ہوں ایسی حالت کے شرعی احکام فقہ میں نہیں تو کیا کتاب و سنت میں بتائے گئے ہیں ؟ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ شراب کی دوکان میں شریک ہو کر کاروبار کرنا فقہ میں تو نہیں بتایا گیا ہے لیکن کتاب و سنت میں بتایا گیا۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ ایک

مسلمان اللہ کو حاکم اور آمر مانتا ہے اللہ نے اپنے احکام اور قوانین اپنے رسول کے ذریعہ بھیج دیا ہے رسول اور رسول کے اصحاب نے عملاً بتا دیا ہے کہ حکومت ایسے کی جائے قانون کیسے بنایا جائے ایسی صورت میں کوئی مسلمان اللہ اور اس کے رسول کے نقشہ کے خلاف چلنے والی حکومت میں کیونکر شریک ہو سکتا ہے اور کوئی فقیہ اس کے جواز کی صورت آپ کو کہاں سے لا کر بتا سکتا ہے اللہ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ مشترک حکومت سود کو حلال کرتی ہے اللہ کی شریعت میں جوا، شراب اور زنا حرام ہیں اور جمہوری حکومت ان کو جائز کہتی ہے اللہ نے فرما دیا میرے رسول کے خلاف نہ جاؤ میرے رسول کی اتباع کرو لیکن مشترک حکومت کہتی ہے اس دور کے فلاں فلاں لیڈر ہمارے نمونہ ہیں لہٰذا ایسی حالت میں مسلمان شریک حکومت کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ کہنا سراسر جھوٹ اور افتراء ہے کہ ”مدنی دور کے ابتدائی چند سال وہ ہیں جبکہ ایک صحیفہ کے ذریعہ مسلمان اور یہودی یا مسلم اور غیر مسلم کو ملا کر ایک مشترک نظام بنایا گیا“ (صفحہ ۵۰)

کیا مدینہ کے اس نظام میں اللہ کے رسول ایک لمحہ کے لئے بھی کسی دوسری شخصیت کسی دوسرے دستور اور کسی دوسرے قانون کے تابع بن گئے تھے اللہ کے دستور و قانون کو چھوڑ کر۔ مدینہ میں دستور نہیں بلکہ ایک معاہدہ طے ہوا تھا جس میں فیصلہ کی اعلیٰ اور آخری اتھارٹی اللہ کے رسول کو حاصل تھی کیا آج جمہوری ملکوں میں مسلمان اسی حیثیت میں شریک حکومت ہیں کہاں کی مثال کہاں دی جا رہی ہے افسوس کی بات ہے۔

{حکومت} آج جمہوری حکومتوں میں اللہ اور رسول کی تعلیمات کو تسلیم کرنا اور اس کو آخری سند مانتا تو دور کی بات ہے ان کو کوئی ادنیٰ مقام بھی نہیں دیا گیا ہے چونکہ مدینہ میں اعلیٰ اتھارٹی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کیا گیا تھا اس لئے یہ کہنا بجا ہو گا کہ رسول کسی حکومت اور نظام میں شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ معاہدہ کے

ذریعہ اپنے نظام میں دوسروں کو شریک بنایا تھا۔ اس نقطہ کو عمداً نظر انداز کر کے عموماً نئی کے معاہدات کو غلط طور سے پیش کیا جاتا ہے۔ پھر ایک پہلو یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ آج کے جمہوری نظام میں مسلمانوں کو من حیث القوم شریک نہیں مانا جاتا بلکہ ملک کے ایک عام شہری کی حیثیت سے شریک مانا جاتا ہے نہ کہ بحیثیت مسلمان۔ بلکہ من حیث القوم انھیں الگ سے کوئی مقام دینے کی کوششوں کو فرقہ پرستی اور علحدہ پسندی سمجھا جاتا ہے جو دستوری اعتبار سے ایک بھاری جرم ہے۔

شاتم رسول:

برادر محترم شاتم رسول جیسے سلمان رشدی اور تسلیہ نسرین کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیا جانا چاہئے اس لئے کہ ایسا اس لئے ہو رہا ہے کہ دور جدید میں اظہار رائے کی آزادی دی گئی ہے جو ایک عظیم نعمت ہے جتنا بچہ فرماتے ہیں "اس اعتبار سے دیکھئے تو اظہار رائے کی موجودہ آزادی اہل اسلام کے لئے ایک عظیم نعمت ہے کیونکہ وہ ہمارے لئے تبلیغ و دعوت کے بند راستہ کو لامحدود طور پر کھول دینے والا ہے اب اگر سلمان رشدی جیسے کچھ مظاہر پیدا ہو رہے ہوں تو ہم کو اسے اس نظر سے دیکھنا چاہئے جس طرح ایک کسان باران رحمت میں کیچڑ کے مسئلہ کو دیکھتا ہے بارش میں اگرچہ بعض اوقات کیچڑ کے مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں مگر بارش کے عظیم فائدوں کے مقابلے میں اس جزوی مسئلہ کی کوئی اہمیت نہیں" (صفحہ ۸۶)

اپنے نظریہ کی تائید میں چند باتیں اور بھی کہتے ہیں "شاتم رسول کے متعلق ابن تیمیہ، ابن عابدین اور سبکی وغیرہ کی کتابیں اس وقت لکھی گئیں ہیں جب مسلمانوں کو زمین پر کلی اھوار حاصل تھا اور موجودہ دور میں ایک تو مسلمان مغلوب ہیں شاتم رسول کو ختم نہیں کر سکتے۔ دوسرے اس دور کی ایک بڑی قوت

میڈیا اسلام کو اس بہانے سے تشدد کا مذہب بنا کر پیش کرتی ہے۔
 لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں فتویٰ پر کس طرح اثر انداز ہو سکتی
 ہیں شاتم رسول جس طرح دور افتدار میں قتل کئے جانے کے لائق تھا وہ آج بھی ہے
 اور آئندہ بھی ہمیشہ رہے گا یہ الگ مسئلہ ہے کہ اسے قتل کرنے کی ہمارے اندر
 طاقت نہیں ہے یا ہم اسے قتل نہیں کر پارہے ہیں دنیا کے کسی قانون میں ایسا نہیں
 ہے کہ مجرم پر کسی وجہ سے قانون نہیں لاگو ہو پارہا ہے تو اسے بے قصور اور قابل
 نظر انداز قرار دیا جائے یا کہیں کسی قانون کا نام لے کر مخالفین پر دیکھ بھنڈ کر رہے ہوں
 تو اس قانون کو قانون کی کتاب سے نکال دیا جائے۔ قرآن کی کئی آیات کو لے کر اسلام
 کے خلاف بولنے والے براہر بولتے رہتے ہیں تو کیا ان آیات کو آپ قرآن سے نکال دیں
 گے۔

برادر محترم اپنی بات کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ شاتم رسول
 کی سزا کا حکم مدینہ میں نازل ہوا ہے مکی دور میں شاتم رسول کے خلاف فتویٰ نہیں دیا
 گیا اس لئے اس دور میں شاتم رسول پر فتویٰ نہیں لاگو ہونا چاہئے لیکن اگر یہ اصول
 تسلیم کر لیا جائے تو آج کئی حرام چیزیں حلال ہو جائیں گی اور کئی احکام پر عمل کرنا
 ضروری نہ رہے گا اور نتیجہ کے طور پر اس دور میں شریعت کے ایک بڑے حصے
 سے آزادی کا پروانہ مل جائے گا۔ ملاحظہ فرمائیے "حالانکہ واقعات بتاتے ہیں کہ اس
 معاملہ میں خود اسلام میں حالات کے اعتبار سے فرق کیا گیا ہے چنانچہ ابن تیمیہ اور
 دوسرے حضرات شاتم کی سزا کے جتنے بھی واقعات کا حوالہ دیتے ہیں وہ سب مدنی
 دور سے تعلق رکھتے ہیں یعنی اس دور سے جب کہ اسلام کو با افتدار حیثیت حاصل
 ہو گئی تھی اس کے برعکس مکی دور میں جب کہ افتدار اعلیٰ اسلام کے ہاتھ میں نہیں تھا
 ابوہب کی بیوی ام جمیل نے علی الاعلان رسول کو "مذمما" کہا مگر نہ رسول اکرمؐ نے
 شاتم کی حد بیان فرمائی اور نہ آپ کے اصحاب دوڑے کہ اس شاتمہ کو قتل کر ڈالیں۔"

اس موقع پر ایک عجیب بات دیکھی گئی کہ برادر محترم کی دور کی بات کو پیش کر کے مدنی دور کے صریح حکم کو آج منسوخ کرنے کا حق اپنے لئے تسلیم کرتے ہیں لیکن مفسرین کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ مکی دور کی آیات کو مدنی دور کی آیات سے منسوخ مانیں آں محترم فرماتے ہیں "مثال کے طور پر کسی مستند تفسیر کو پڑھئے آپ پائیں گے اس میں صبر اور اعراض کی آیتوں کو منسوخ بتایا گیا ہے مثلاً القرطبی کی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں و اعراض عن المشرکین کے تحت لکھا ہوا ہے کہ وہ منسوخ ہے "ہو منسوخ بقولہ فاقتلوا المشرکین" اسی طرح آیت "واصبر وما صبرک الا باللہ" کے تحت درج ہے کہ جنگ کی آیات آنے کے بعد وہ منسوخ ہو گئی۔ صی منسوخہ بالقتال" (صفحہ ۵۹)

یہ کیسی الٹی بات ہے کہ آں محترم کے نزدیک پہلے والا حکم بعد کے حکم کو منسوخ کر سکتا ہے لیکن بعد کا حکم پہلے والے حکم کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

دینی لٹریچر

برادر محترم اور نگ زب عالمگیر سے ملے کر اس دور کے مشہور عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندوی تک سب کو نا اہل قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کو ایک نہیں کئی بار بے خبر لکھا ہے ان کی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں آں محترم کو کوئی عقلی بات نہ ملی۔ علامہ اقبال، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب شہید آں جناب کی نظر میں اس دور کی سب سے بڑی مصیبت ہیں۔ اسی طرح قدیم و جدید سارے دینی لٹریچر خواہ تفسیری ہو یا حدیثی سیرت سے متعلق ہو یا تاریخ سے سب کا سب حاسبر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انکے نظریہ اعراض کے خلاف سارے علماء فقہاء،

محدثین اور مفسرین اور انکی کتابیں ہیں چنانچہ لکھتے ہیں "اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مذکورہ قسم کی کتابوں میں بعد کے زمانہ میں پیش آنے والے حالات کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتابیں اپنی تمام خوبیوں کے باوجود موجودہ زمانہ کے اعتبار سے غیر متعلق ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہی کم و بیش اس پورے تصنیفی ذخیرہ کا حال ہے جس کو آج اسلامی کتب خانہ کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ کسی مستند تفسیر کو پڑھئے۔ آپ پائیں گے کہ اس میں صبر و اعراض کی آیتوں کو منسوخ بتایا گیا ہے مثلاً القرطبی کی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں و اعراض عن المشرکین کے تحت لکھا ہوا ہے کہ وہ منسوخ ہے۔ ہو منسوخ بقولہ فاقتلوا المشرکین (۶۲/۱۰) اسی طرح آیت و اصبر و ما صبرک الا باللہ کے تحت درج ہے کہ جنگ کی آیت نازل ہونے کے بعد وہ منسوخ ہو گئی ہی منسوخۃ بالقتال (۲۰۲/۱۰)

صبر و اعراض اسلام کا اہم ترین حکم ہے۔ قرآن میں کہیں بالواسطہ انداز میں اور کہیں براہ راست طور پر اس کی تاکید کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ پورا قرآن کتاب صبر ہے مگر جو آدمی تفسیر کی ان کتابوں کو پڑھے اس کا عام تاثر فطری طور پر یہ ہو گا کہ صبر و اعراض کی آیتیں اب صرف تلاوت کیلئے ہیں۔ اب اس سے متعلق جو قرآنی حکم ہے وہ صرف جہاد و قتال ہے۔ صبر و اعراض کا حکم کمزوری کے دور میں تھا۔ اب مسلمان طاقتور ہیں، اب ہمیں صبر نہیں کرنا ہے بلکہ لڑ کر غیر اسلامی عناصر کو زیر کرنا ہے۔

اسی طرح حدیث کی کتابیں بے شمار قیمتی تعلیمات سے لبریز ہیں مگر اپنی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے وہ غلط فہمی کا باعث بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ صحاح ستہ یا حدیث کی اور کوئی مستند کتاب اٹھا کر دیکھیں اس میں آپ کو دعوت و تبلیغ کا باب نہیں ملے گا موجودہ کتب حدیث میں، باعتبار ترتیب، ہر قسم کے ابواب

ہیں مگر دعوت و تبلیغ کا باب ان میں سرے سے موجود نہیں۔

جو لوگ ان کتب حدیث کو پڑھتے ہیں وہ قدرتی طور پر تراجم ابواب کے تحت انہیں پڑھتے ہیں۔ اس طرح ان کو پڑھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر قاری کے اندر غیر دعوتی ذہن بنتا ہے جہاد و قتال کے ابواب سے تو وہ خوب آشنا ہو جاتا ہے مگر دعوت و تبلیغ کی اہمیت سے وہ بکسر غافل رہتا ہے۔

اسی طرح سیرت رسولؐ پر لکھی جانے والی کتابوں کو دیکھئے۔ سیرت کی تقریباً تمام مستند کتابیں غزواتی مہزن پر لکھی گئی ہیں ابن ہشام کی مشہور چار جلدوں کی سیرت کا ایک جلد سے کچھ زیادہ حصہ ۱۳ سالہ مکی دور پر ہے اور بقیہ تقریباً تین جلدیں ۲ سالہ مدنی دور پر۔ مدنی دور کے ابواب کی ترتیب سیرت کی تمام کتابوں میں غزوات کی بنیاد پر کی جاتی ہے حتیٰ کہ سیرت کی ابتدائی کتابوں کا نام ہی ”مغازی“ ہوا کرتا تھا اگرچہ بعد کی کتابوں کے نام مغازی پر نہیں رکھے گئے۔ مگر عملاً سیرت کی تقریباً تمام کتابیں مغازی ہی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تاریخ تک پہنچ کر یہ صورت حال اور زیادہ سنگین ہو جاتی ہے کیونکہ تاریخ اسلام پر لکھی جانے والی کتابیں، تقریباً بلا استثناء جنگ آزمائی اور کشور کشائی کی داستان نظر آتی ہے یہ سیاسی فتح و شکست اور بادشاہوں کی موت و حیات کا بیان ہو کر رہ گئی ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے پہلی بار اسلامی تاریخ کی اس کمی کا احساس کیا اور وسیع تر انداز میں اسلام کی جامع تاریخ لکھنا چاہا۔ انہوں نے اپنے مقدمہ تاریخ میں کامیابی کے ساتھ اس جدید تاریخ کے اصول مقرر کئے مگر وہ خود بھی اس انداز پر اسلام کی تاریخ مرتب نہ کر سکے۔

بعد کے دور میں جو کتابیں لکھی گئیں (صوفیا کی غیر معبر کتابوں کو چھوڑ کر) تقریباً سب کی سب اسی پنج پر تھیں۔ مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ کی کتاب ”حجۃ اللہ ابانہ“ کو مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ایک معرکہ آرا کتاب بتایا ہے اور لکھا ہے کہ

”اس میں دین و نظام شریعت کا نہایت مربوط، جامع اور مدلل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔“
(صفحہ ۲۱۵)

”مگر اس کتاب کا حال یہ ہے کہ اس میں مسواک اور سترہ تک کے ابواب ہیں
مگر اس میں دعوت و تبلیغ کا سرے سے کوئی باب ہی نہیں۔ اس کے برعکس اس میں
جہاد و قتال کو سب سے زیادہ اہم اسلامی عمل بتایا گیا ہے۔“ (صفحہ ۵۹ تا ۶۱)
مذکورہ بالا اقتباس میں اسلاف کے پورے تصنیفی ذخیرہ کو غیر معتبر ٹھہرایا
گیا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں جہاد و قتال کو سب
سے زیادہ اہم اسلامی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جبکہ جہاد و قتال کی باتیں اس
محترم کے نزدیک تشدد اور تعدی کے ہم معنی ہیں اور ہندوستان میں کفار و مشرکین
کے سامنے سرنگوں ہونے اور سپر ڈال دینے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی
دنیا کو جس کے منجھڑ خونی سے ہو خطر

فتویٰ ہے شیخ کا کہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر

مسائل قدیم و دلائل جدید

”دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم قاری محمد طیب صاحب (۱۹۸۳ء اور ۱۸۹۵ء)
جو حکیم الامت کے نام سے مشہور ہیں ان کا ایک طویل مقالہ میں نے بڑھاپہ پورا

مقالہ "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے موضوع پر تھا مگر اس میں مجھے اصل سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملا مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ "اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں ہے کہ مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں تاکہ یہ نئی تشکیل قائم کر کے ہم خلافت الہی اور نیابت نبوی کا حق ادا کر سکیں۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اس نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں۔" (فکر اسلامی کی تشکیل جدید صفحہ ۸۳)، (صفحہ ۶۲)

اس انتخاب میں برادر محترم کو اصل سوال کا کوئی واضح جواب نہ ملنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ محترم قاری محمد طیب صاحب نے خلافت الہی اور نیابت نبوی کو مرکزی نقطہ قرار دیا ہے اگر وہ کہتے کہ اسلام فکر اسلامی کی تشکیل جدید کیلئے تصور جہاد کو اس دور میں ختم کر دینا ضروری ہے تو آپ دیکھتے کہ وہ قاری صاحب کو دور جدید کا صحیح معنی میں حکیم الامن قرار دیتے۔

مگر مسائل قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں کا نظریہ فقہ کے بارے میں کلی طور پر درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ابدی ہے۔ جب کہ فقہ کی حیثیت اس کے مقابلہ میں وقتی اور زمانی ہے۔

مثال کے طور پر ماری مدون فقہ پوری دنیا کو دو خطوں میں تقسیم کرتی ہے دارالاسلام اور دارالحرب، دارالاسلام وہ ملک ہے جہاں اسلام کا قانون نافذ ہو۔ اور دارالحرب وہ ملک ہے جہاں اسلام کا قانون نافذ نہ ہو۔ اس فقہ کی روشنی میں، مسلمان دارالحرب کے مقابلہ میں امکانی طور پر برسر جنگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قاری طیب صاحب کے مذکورہ اصول کے مطابق، اس قدیم فقہی اصول کو جدید دلائل سے آراستہ کر کے دوبارہ مستحکم کیا جانا چاہیے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ طرز فکر یقینی طور پر درست نہیں۔ آج اصل ضرورت یہ ہے کہ اس فقہی تقسیم پر نظر ثانی کی جائے، نہ کہ

اس کو از سر نو مدلل کرنے کی ناکام کوشش کی جائے۔

قدیم فقہ اور جدیدی حالات میں فرق کی بناء پر اس طرح کے بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں مگر جامد تقلید کی بنا پر لوگ نہ تو انہیں سمجھ سکے اور نہ اس کے حل کی راہ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

قرآن اور فقہ دونوں کی حیثیت ہر کوئی جانتا ہے فقہ کو قرآن کے برابر کوئی نہیں سمجھتا لیکن فقہ کو کنڈم کرنا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس کی بنیاد قرآن و سنت ہی ہے۔ فقہ نے پوری دنیا کو دو خطوں میں تقسیم کیا ہے تو آخر کیوں غلط ہے؟ اس کا جواب آں محترم کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہماری مدونہ فقہ نے ایسا تقسیم کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں آخر یہ بھی کوئی دلیل ہے؟ سوچنے کی بات ہے۔ دو چار آیات قرآنی اور احادیث نبوی پیش کر کے بتایا جاتا کہ اللہ اور اس کے رسول نے دنیا کی پانچ تقسیم کی ہے اور فقہ دو ہی تقسیم کر رہی ہے اسی لئے یہ تقسیم غلط ہے تو یہ ایک بات ہو سکتی تھی مگر نہ تو کوئی نقلی دلیل پیش کی گئی اور نہ اصلی۔ پھر یہ بھی کوئی دلیل ہے کہ اس تاریخ سے دنیا کے تمام ممالک و اہل حرب قرار پائیں گے۔

قرآن کی رو سے سارے انسانوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اہل حق یا اہل باطل، اولیاء اللہ یا اولیاء الشیطان، مومن یا کافر، تو دنیا کا دو خانوں میں تقسیم کرنے میں آخر کونسی شرعی یا عقلی قباحت ہے؟ آپ کو اس سے کیوں متلی ہو رہی ہے؟ خدا کی زمین پر شیطان کی حکومت قائم کرنے والوں سے آپ کی گاڑھی چھنتی ہے اور ان کیلئے اپنے دل میں بڑی وسعت رکھتے ہیں لیکن خدا کی زمین پر خدا کی حکومت قائم کرنے کی بات بڑی کڑوی لگتی ہے۔

گمراہی کی بات

”اس پسماندگی کا واحد سبب جدیدی علوم میں مسلمانوں کا پچھڑا پن ہے

مسلمان جدید علوم میں پچھے ہو گئے اس لئے وہ جدید صنعت میں بھی پچھے ہو گئے اور جدید صنعت کے پچھے ہونے کے نتیجہ میں وہ دور جدید کے ہر شعبہ میں پچھڑ کر رہ گئے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں تمام چیزوں کا تعلق علم سے ہو گیا۔ (صفحہ ۷۹)

مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب جدید علوم میں مسلمانوں کا پچھڑا پن بتایا جاتا تو بڑی حد تک صحیح ہوتی اور کسی کو اس سے انکار نہیں ہوتا۔ لیکن اس کو واحد سبب بتانا یہ بڑی گمراہی کی بات ہے۔ واحد سبب اگر کسی چیز کو کہا جاسکتا ہے تو وہ ہے دین سے دوری، کتاب و سنت سے وابستگی میں کمی، اس کے علاوہ کسی بھی سبب کو واحد سبب نہیں کہا جاسکتا۔ مسلمان جب عروج اور ترقی کے اعلیٰ مقام پر پہنچے تھے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اپنے دور کے علوم میں سب سے آگے تھے بلکہ عروج کا واحد سبب دین و لہمان میں پختگی تھا۔ اس لئے اس پسماندگی کو ختم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دین سے وابستگی ہے۔

لن یصلح اخر هذا الامة الا بصلاح اولها

یعنی اس امت کے بعد کے لوگ اسی چیز کے ذریعہ درست ہوں گے جس سے پہلے کے لوگ درست ہوئے تھے۔

اس قول میں مکمل بات بتادی گئی ہے۔

سیکولرزم

”دور جدیدی کے فکری مسائل میں سے ایک وہ ہے جو سیکولرزم کی نسبت سے پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسٹیٹ پالیسی کیلئے سب سے زیادہ مقبول اور مستند نظریہ وہی ہے جس کو عام طور پر سیکولرزم کہا جاتا ہے۔ کسی اسٹیٹ کا سیکولر ہونا اس کے ترقی یافتہ ہونے کی علامت ہے اور اس کا غیر سیکولر ہونا اس کے غیر ترقی یافتہ ہونے کی علامت۔

مسلمانوں کا ایک گروہ، خاص طور پر اسلام پسند طبقہ سیکولرزم کے سخت خلاف رہا ہے وہ اس کو ایک اسلام دشمن نظریہ کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کو غیر مذہبی اور خالص دنیوی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ اس طرح وہ اسلام کی نفی بن جاتا ہے کیونکہ اسلام کا تقاضہ یہ ہے کہ ریاست کو وحی الہی کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے۔

مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلام پسند حضرات کی یہ رائے سیکولرزم کے انتہا پسند نمائندوں کی رائے کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ مگر یہ ایک ایسی غلطی ہے جسے کچھ غیر مسلم دانشور انتہا پسند مسلم نوجوانوں کے جنگ جویانہ خیالات کو لیکر اس کی بنیاد پر اسلام کی تصویر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیکولرزم کے بارے میں وہی رائے درست ہے جو انسانیت کو پیڈیا آف ریلیجن ایڈ اسٹیکس میں دی گئی ہے اس کے مطابق سیکولرزم کسی مذہب مخالف نظریہ کا نام نہیں، وہ اس بات کا نام ہے کہ اسٹیٹ اپنے آپ کو اس کا پابند بنالے کہ وہ ہر شہریوں کے مذہبی معاملات میں عدم مداخلت (non - interference) کی پالیسی اختیار کریگی۔ یہ دراصل ایک عملی بندوبست کی بات ہے نہ کہ کوئی مقدس نظریہ، اپنی رو کے اعتبار سے صلح حدیبیہ جیسا ایک عمل حل ہے اور وہ اہل اسلام کے عین حق میں ہے۔

سیکولرزم نے تاریخ میں پہلی بار اہل توحید کو یہ موقع دیا کہ ریاست کی طرف سے تعذیب (Persecution) کا خطرہ مول لینے بغیر اپنے عقائد کی آزادانہ تبلیغ کریں۔ جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق ہے تو وہ "اسلام حکومت قائم کرو" کے نعرے سے قائم نہیں ہوتی۔ پاکستان کی مثال اس کا واضح ثبوت ہے۔ سیکولرزم کا اصول ہمیں یہ موقع دیتا ہے کہ ہم آزادانہ طور پر ساری دنیا میں اسلام کی پر امن اشاعت کریں۔ اس عمل کے نتیجہ میں کسی سماج کی اکثریت میں اگر اسلامی حکومت

کی طلب پیدا ہو جائے تو وہاں اسلام کی حکومت بھی قائم ہو سکتی ہے اور اسلام کی حکومت ہمیشہ سبکی طلب کی بنیاد پر ہی قائم ہوتی ہے۔ وہ مطالباتی سیاست کے ذریعہ کبھی قائم نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۸۶ تا ۸۷)۔

غور کیجئے برادر محترم نے سیکولرزم کے بارے میں اسلام پسندوں کی رائے سے اختلاف تو کیا ہے لیکن اختلاف کی وجہ نہ کوئی شرعی بنیاد بتلائی ہے اور نہ کوئی عقلی اصول۔ آں محترم کو یہاں یہ بتلانا چاہئے تھا کہ اسلام پسندوں نے جس دلیل کی بنیاد پر سیکولرزم کو اسلام کی نفی قرار دیا ہے وہ بنیاد صحیح نہیں ہے اور اسلام پسندوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ سیکولرزم میں ریاست کی بنیاد غیر مذہبی اور خالص دنیادی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اور اسلام میں ریاست کی بنیاد وحی الہی پر قائم ہوتی ہے لیکن اسلام پسندوں کی ان دو دلیلوں میں سے کسی ایک دلیل پر بھی کوئی بحث نہیں فرمائی گئی ہے

اسلام پسندوں نے سیکولرزم سے اسلام کی نفی کا نتیجہ دو مقدموں سے نکالا تھا ایک تو یہ کہ سیکولرزم میں ریاست کی بنیاد غیر مذہبی ہوتی ہے اور اسلام میں ریاست کی بنیاد وحی الہی پر ہوتی ہے۔ ان دو چیزوں میں سے کسی بھی چیز کی برادر محترم تردید نہیں کر سکے اور نہ کر سکتے تھے اس لئے ایک چٹکے چھوڑا اور دامن بچا کر نکل گئے۔ یہ کہنا کہ اسلام پسند حضرات کی یہ رائے سیکولرزم کے انتہا پسند نمائندوں کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے، کافی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ سیکولرزم کے احوال پسند نمائندوں کی کیا رائے ہے؟ کیا وہ ریاست کی بنیاد وحی الہی پر رکھنے کی بات کرتے ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو احوال پسندوں کی رائے بتا کر اسلام پسندوں کے خیال کی تردید باآسانی کی جاسکتی تھی۔ مگر اس طرح کی کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے اس لئے لائیں گے تو کہاں سے لائیں گے؟

اپنے ہندوستان میں پچاس سال سے سیکولر جمہوریت کا دور دورہ ہے لیکن آج

تک سیکولرزم کی تعریف نہیں کی جاسکتی ہے۔ دستوری، قانونی اور عملی کسی اعتبار سے سیکولرزم کی شکل متعین نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے برادر محترم کو سیکولرزم کے مفہوم کو تلاش کرنے کے لئے انسائیکلو پیڈیا کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ جس سے معلوم ہوا کہ سیکولرزم مخالف مذہب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ بات تشنہ رہی کہ سیکولرزم اپنے نظام میں مذہب کو دخل دینے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ عام طور سے سیکولر پسند لوگ اس سوال کو نظر انداز کر دیتے ہیں اس لئے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ سیکولرزم مخالف مذہب نہیں ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ سیکولرزم پرائیوٹ اور نجی زندگی میں مخالف نہیں ہے اور جہاں تک سوال اجتماعی زندگی یعنی حکومت اور سیاست کا دائرہ ہے اس دائرے میں سیکولرزم اسلام کیا کسی بھی مذہب کو جھانکنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے اسلام پسندوں کا کہنا ہے کہ اس بات کو وہ لوگ تسلیم کر سکتے ہیں جن کے یہاں مذہب کا تعلق صرف پرائیوٹ زندگی سے ہے۔ جن کے یہاں پوجا پاٹ کی محض چند مراسم کا نام مذہب ہے۔ لیکن مسلمانوں کا مذہب پوری زندگی کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ پوری طرح اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اور اللہ کے رنگ میں مکمل رنگ جاؤ۔ جہاں دین کے بعض حصے کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا پورے دین کو نہ ملنے کے برابر قرار دیا ہے شریعت اسلامی کے قانون سے ہٹ کر فیصلہ کرنے کو لہمان کے منافی ہونے کی صراحت موجود ہے کوئی قانون اور ضابطہ کتاب و سنت کی ہدایات کو نظر انداز کر کے بنانا لہمان کے خلاف ہے۔ حکم دینے اور کسی بات سے روکنے کا حق صرف خدا اور رسولؐ کو جو دیتا ہے ایسے مذہب کا ملنے والا شخص کیسے یہ تسلیم کریگا کہ سیکولرزم مذہب مخالف نہیں ہے جب کہ سیکولرزم اجتماعی معاملات حکومت اور سیاست کے دائرے میں کسی مذہبی دخل اندازی کے لیے قطعاً رد دار نہیں ہے مذہب کے نام پر کسی شخص کا سیکولر نظام کی اسمبلی اور پارلیمنٹ میں داخل ہونا تو دور کی بات ہے وہ بحیثیت امیدوار الیکشن میں

کمزور بھی نہیں ہو سکتا۔

۱۰ اسٹیٹ اپنے کو اس کا پابند بنالے کہ وہ شہروں کے مذہبی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرے گا۔ یہ سیکولر نظام کی ایک پالیسی ہے سیکولرزم کی یہ تعریف نہیں ہے۔ اس پالیسی کی وجہ سے سیکولرزم کو مخالف اسلام نہ سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہندو مت اور چین مت کو اس بنا پر مخالف اسلام نہ سمجھنا کہ ان دونوں مذہبوں میں جانداروں پر مہربانی کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ ان مذہبوں کی تعریف نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان مذاہب کی یہی ایک اچھائی ہے کچھ اچھائیاں ہر مذہب اور ہر نظریہ میں ہوتی ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن ان مذاہب کی بنیادی بات وہ عقائد ہیں جو خدا کی ذات و صفات اور انسان اور خدا کے درمیان اور پھر انسان انسان کے درمیان تعلقات کی بنیاد بنتے ہیں اسی طرح سیکولرزم کیا ہے یہ جاننے کے لیے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اس نظریہ میں خدا کی ذات و صفات کے بارے میں کیا عقائد ہیں حاکمیت اور قانون سازی کا حق اس نظریہ میں کس کو دیا گیا ہے پھر اس نظریہ میں کس شخصیت کو نمونہ عمل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اخلاق، قانون، محبت، معاشرت اور سیاست کے اصول کہاں سے لیے گئے ہیں اس زوایہ نظر سے آپ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ سیکولرزم سراسر اسلام کے خلاف ہے جہاں تک سیکولرزم میں کچھ فائدے کا مسئلہ ہے اس سے کسی کو انکار نہیں جیسا کہ کوئی یہ نہیں کہتا کہ شراب میں کسی طرح کا کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن جس طرح کچھ فائدے کی وجہ سے شراب حلال نہیں ہو جاتی اسی طرح کچھ فائدے کی بنا پر سیکولرزم قابل قبول نہیں ہوگا۔

اسلام

۱۔ اسلام کی نگاہ میں سب سے بڑی حقیقت توحید ہے۔ خدا کا وجود، اس کا وجود، اس کا وحدہ لاشریک ہونا اور اس کی حاکمیت اور ربوبیت کو تسلیم کرنا ہے اسلام کا پورا نظام خدا کی بندگی سے عبارت ہے اور اس کی حاکمیت سے تابع ہے۔

سیکولرزم

۱۔ سیکولرزم وجود باری تعالیٰ اور اس کی صفات کے باب میں یا تو بالکل خاموش ہے یا بحث کرتا ہے تو سیکڑوں خداؤں کے لئے اس کے اندر گنجائش ہے لیکن اپنے نظام میں ایک خدا کا بھی عمل دخل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اسلام

۲۔ اسلام مادہ پرستانہ اور ملحدانہ تصور سے بغاوت پر مبنی ہے وہ ساری انسانیت کو انبیاء کرام کے بتائے ہوئے طریقہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔

سیکولرزم

۲۔ سیکولرزم مادہ پرستانہ تہذیب کی پیداوار ہے جس کا غلہ کی رہنما انبیاء علیہم السلام ہیں اس سے اسے کوئی نسبت نہیں ہے۔

اسلام

۳۔ اسلام کی نگاہ میں زندگی گزارنے کا صحیح راستہ خالق کائنات نے طے کر دیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اس کی نشاندہی کر دی ہے۔ اس کے نزدیک خیر و شر اور

کی لمبی گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا۔

قال رستم ما جاء بكم قال الله ابتعثنا والله
جاء بنا لتخرج من شاء من عبادة العباد الى
عبادة الله (تاریخ خطیری)

رستم نے پوچھا کہ تم کس لئے ہمارے ملک میں آئے ہو
انہوں نے کہا کہ ہم کو اللہ نے بھیجا ہے اور ہم کو اللہ لے آیا ہے تاکہ
وہ جس کو چاہے اس کو ہم بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی
عبادت کی طرف لے آئیں۔

صحابی کی اس تقریر سے مذکورہ سبلی نظریہ نکالنا بلاشبہ ایک
نامحسوس جسارت ہے حتیٰ کہ وہ اسلام کی تصویر کو بگاڑنے کے ہم معنی
ہے۔ صحابی کے مذکورہ قول میں اسلام کی توسیعی انسانیت
EXTENDED HUMANITY کو بتایا گیا ہے۔ مگر عدم
واقفیت کی بنا پر غلط تعبیر کر کے اس کو اسلام کی توسیعی سیاست
EXTENDED POLITICS کے معنی میں لیا گیا ہے۔ یہ یقینی
طور پر صحابی کے ایک قول کی نہایت غلط توجیہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ
اس وقت ایرانی حاکموں اور اہل اسلام کے درمیان جنگ پیش آئی۔
لیکن جنگ کی حیثیت پورے معاملہ میں محض اضافی یا اتفاقی تھی۔ وہ
اس کا اصل مطلوب نہ تھی) (صفحہ ۱۱-۱۲)

اوپر نقل کردہ اکتیاس میں جو بات بڑے اونچے مقام سے برادر محترم نے
فرمائی ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ یہ جاننے کے لئے دو سوالوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۱)۔ یہ نظریہ کہ مسلمان سارے عالم کے قائد اور حاکم ہیں کیا دینی اعتبار سے

صحیح ہے ؟

گذاڑیں۔ اسلامی جہاد کا یہ تصور دور جدید کے اس متفقہ بین اقوامی تصور سے ٹکراتا ہے کہ ہر ملک پر لازم ہے کہ وہ دوسرے ملک کی سرحدوں کا احترام کرے۔ اور کوئی قوم کسی دوسری قوم کے معاملہ میں مداخلت نہ کرے۔

مگر جہاد کے اس تصور کا قرآن و سنت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ یا تو بعض انتہا پسند مسلم نظریہ سازوں کی اختراع ہے یا غیر مسلم دانشوروں کا اپنا گھڑا ہوا ہے۔ قرآن کے مطابق جہاد (بمعنی قتال) کی صرف دو قسمیں ہیں۔ ایک استیصال فتنہ کے لئے (وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ) اور دوسری دفاع کے لئے (وَقَاتِلُوا الَّذِينَ يَقَاتِلُونَكُمْ)۔

فتنہ سے مراد اردو معنی میں ”فتنہ فساد“ نہیں ہے اس سے مراد مذہبی تعذیب (Religious persecution) قدیم زمانے میں عرب میں اور ساری دنیا میں یہ فتنہ موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اور اصحاب رسول کو حکم دیا کہ اس کے خلاف جدوجہد کر کے اس مصنوعی رکاوٹ کا خاتمہ کر دو۔ چنانچہ انہوں نے اس کا مقابلہ کر کے اس کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اب اس فتنہ کا دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے۔ اس لئے اب اس نوعیت کے جہاد کی ضرورت بھی نہیں۔

دفاع کے لئے جہاد کا حکم اب بھی باقی ہے۔ اور قیامت تک باقی رہے گا۔ تاہم دفاعی جہاد شروع کرنے کے لئے بہت سی لازمی شرطیں ہیں۔ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہوں کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ دفاع کے نام پر بطور خود کسی کے خلاف جنگ چھیڑ دے۔

ان دو صورتوں کے سوا کوئی بھی تیسری صورت نہیں ہے۔ جس کے لئے اسلام میں جہاد (بمعنی قتال) کسی کے لئے جائز ہو۔ (صفحہ ۸۷ تا ۸۸)

مذکورہ بالا پورے اقتباس پر غور کرنے سے برادر محترم کا ایک دعویٰ یہ سامنے آتا ہے کہ جہاد کے اس تصور کا قرآن و سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس دعویٰ

کی دلیل کے طور پر پہلی بات یہ ہے کہ اسلامی جہاد کا یہ تصور دور جدید کے مستفاد بین الاقوامی تصور سے ٹکراتا ہے۔ یہاں اس بات کے سلسلہ میں ہمارے خیال میں دورائے نہیں ہو سکتی کہ اس ٹکراؤ والی بات کو کوئی شرعی دلیل کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ دور جدید کے سارے نظریات کی بنیاد مادہ پرستی ہے اس لئے تصور جہاد ہی کیا پورا اسلام دور جدید کے افکار سے متصادم ہے۔ دوسری بات جناب نے یہ فرمائی ہے کہ جہاد بمعنی قتال کی صرف دو قسمیں ہیں ایک استیصالِ فتنہ کے لئے اور دوسرے دفاع کے لئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بتایا ہے کہ اب فتنہ کا دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے اس لئے اب اس نوعیت کے جہاد کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن اس بات میں بھی دلیل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بات اس وقت قابل قبول ہو سکتی ہے جبکہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ فتنہ سے مراد مذہبی تعذیب ہے اور اس دور میں مذہبی تعذیب کا کہیں وجود نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ہم پورے چیلنج کے ساتھ کہیں گے کہ فتنہ کے وہ معنی نہیں ہیں جو برادر محترم بتاتے ہیں فتنہ سے مراد شرک ہے۔ اس بات کی تصدیق تفسیر کتب تفسیر سے کی جاسکتی ہے۔

پھر یہ سوچئے کہ فتح مکہ کے بعد جب کہ مذہبی تعذیب کا خاتمہ ہو گیا تھا اس کے بعد اسلامی فوجوں نے جہاد کا سلسلہ جاری رکھا نہ صرف عرب کے دور دراز علاقوں میں بلکہ ایران، روم اور فارس کی سرحدوں میں گھس کر قتال کیا آخر یہ کس نوعیت کا جہاد تھا اور اس کی کیا وجہ تھی خلافت راشدہ کے دور کی مثالیں تو ضرور بالضرور قرآن کی تفسیر اور دلیل شرعی کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں اس کے بعد حضورؐ کے اس ارشاد پر غور کیجئے کہ الجہاد ماضی الی یوم القیامتہ۔ یعنی جہاد قیامت تک جاری رہنے والا ہے۔ اس حدیث میں کسی خاص نوعیت کے جہاد کے جاری رہنے کی بات نہیں کی گئی ہے ؟ اس لئے اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں نوعیت کا جہاد اب باقی

نہیں ہے تو اسے اس مسئلہ خاص کے لئے کوئی دلیل دینی ہوگی۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت تک جہاد کی علت موجود رہے گی اس لئے جہاد بھی جاری رہے گا۔ دوسری نہایت غلط بات موصوف کا یہ فرمانا ہے کہ دفاعی جہاد شروع کرنے کے لئے بہت سی لازمی شرطیں ہیں یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ دن ہونے کے لئے غروب شمس ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ہم عرض کریں گے کہ دفاعی جہاد کے لئے ملک اور مقام کی، زمانہ اور وقت کی، کثرت اور قلت کی، خوشحالی اور تنگی کی کوئی شرط نہیں ہے ہر شخص پر فرض ہوتا ہے کہ وہ دفاعی جہاد میں شریک ہو اور اپنا حق ادا کرے حتیٰ کہ عورت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اس کے لئے بھی نکلنا واجب ہوگا ضرورت پر یعنی عورت کو شوہر سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں سیٹھ کو باپ کی غلام کو اتا کی اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ دفاعی جہاد فرض عین ہوتا ہے۔ (بحوالہ تفسیر القربطی)

جہاد کا مفہوم اور اس کی غرض و غامت پورے طور سے سمجھنے کے لئے ہم محض ایک آیت، ایک حدیث اور چند علماء کی بات یہاں پیش کرتے ہیں۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا
يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ
أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (التوبہ ۲۹)

جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت میں لڑائی کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ کفار و مشرکین کی خود مختاری

اور بالادستی ختم ہو جائے وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین پر نظام زندگی کی باگیں اور فرمانروائی و امامت کے اختیارات دین حق کے ماننے والوں کے ہاتھوں میں آجائیں اور کفار و مشرکین ان کے ماتحت تابع اور مطیع بن کر رہیں۔ اس آیت سے قتال کی وجہ مذہبی تعصب نہیں معلوم ہوتی بلکہ قتال کی وجہ اور علت دین حق کو نہ ماننا اور مشرکین کی بالادستی ہے۔

مسند امام احمد کی ایک لمبی حدیث کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔

قال وما الجهاد قال ان تقاتل بينك وبين الكفار اذ لقيتم
یعنی پوچھنے والے نے پوچھا کہ جہاد کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ جہاد یہ ہے کہ تم کفار سے لڑو جب کہ تمہاری ان سے مذہبی ہو جائے۔

بخاری شریف کے شارح ابن حجر نے جہاد کی تعریف میں کہا ہے کہ

وبذل الجهاد في قتال الكفار

یعنی جہاد نام ہے کفار سے جنگ میں کوشش کو خرچ کرنے کا

بخاری کے ایک دوسرے شارح کے الفاظ ہیں

قتال الكفار لنصرة الاسلام واعلاء كلمة الله.

یعنی اسلام کی مدد اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے کفار سے جنگ کرنا

جہاد ہے۔

صاحب در مختار نے لکھا ہے۔

الدعاء الى الدين الحق و قتال من لم يقبله

یعنی دین حق کی طرف بلانا اور جو اس کو قبول نہ کریں اس سے جنگ کرنا یہ

جہاد ہے۔

علامہ ابن رشیہ نے لکھا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ جب مطلق بولا جاتا ہے

تو اس سے مراد کفار سے جہاد بالسیف کرنا ہوتا ہے مذکورہ بالا آیت، حدیث اور علماء

کی باتوں سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ جہاد کے مفہوم میں اگرچہ کئی باتیں شامل ہیں لیکن جب جہاد فی سبیل کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے جہاد بالسیف ہی مراد ہوتا ہے پھر اوپر کی گفتگو سے یہ بات بھی اچھی طرح سے سمجھی جاسکتی ہے کہ جہاد بمعنی قتال کو براہِ محترم نے ختم کرنے یا محدود کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ یا تو ناواقفیت کی بنا پر ہے یا پھر اس کا محرک کوئی ایسی چیز ہے جس کو ہم اپنی زبان پر بھی نہیں لاسکتے۔

بینک کا سود

”اس معاملہ میں میں کوئی حتمی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ یہ مسئلہ ایسا ہے جس کو علماء کی شوریٰ میں اجتماعی فیصلہ سے طے کیا جانا چاہئے۔ تاہم میں یہ کہنے کی جرات کر دوں گا کہ کچھ لوگوں کی یہ تجویز قابلِ غور ہے کہ بینک کا انٹرسٹ کمرشیل انٹرسٹ ہوتا ہے اور ہم کو کمرشیل انٹرسٹ اور حاجاتی سود (usury) میں فرق کرنا چاہئے۔“

حاجاتی سود ایک طرفہ نفع اندوزی پر مبنی ہے۔ اور اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن کمرشیل انٹرسٹ نفع میں شرکت (Profit sharing) کے اصول پر مبنی ہے اس اعتبار سے وہ ایک حق تک مضاربہ کے اسلامی اصول سے مشابہت رکھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مضاربہ میں نفع اور نقصان دونوں میں شرکت ہوتی ہے اور بینک میں صرف نفع میں شرکت۔

لیکن مضاربہ اگر کامیاب اصول ہے تو وہ اس لئے کامیاب اصول ہے کہ اس میں زیادہ امکان نفع کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر نقصان کا اندیشہ بڑھ جائے تو مضاربہ کا اصول عملاً معطل ہو جائے گا۔ اس پہلو کو سامنے رکھا جائے تو مضاربہ اور کمرشیل بینکنگ کا فرق زیادہ تر جزئی اور اضافی بن جاتا ہے نہ کہ کلی اور حقیقی۔“

بنک انٹرسٹ کے بارے میں آپ کے نزدیک علماء کی شوریٰ میں اجتماعی فیصلہ کرنا چاہئے اور آپ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے تو آپ اس کو آدھا جائز بتانے کی جرات کیوں کر رہے ہیں ؟

اسلامی مشن کیا ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام کی ذمہ داری یا اسلامی مشن کا نشانہ لوگوں کے اوپر اسلامی سسٹم کا عملی نفاذ نہیں ہے بلکہ پر امن حدود میں رہتے ہوئے لوگوں کو اسلام سے باخبر کرنا ہے داعی اسلام کی ذمہ داری صرف اسلام پہنچانا ہے اس کے بعد اب مدعو کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو مانے یا اس کا انکار کر دے ۔ (صفحہ ۱۳۱)

اس عبارت کی روشنی میں ہجرت اور جہاد، ایثار و قربانی کے متعلق ساری تعلیمات بلاوجہ کتاب و سنت اور تاریخ اسلام میں نظر آتی ہیں ۔ پھر حضور کے اس ارشاد کا کوئی محل نہیں ہوگا کہ آپ نے فرمایا

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ
یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کر دوں یہاں تک کہ لوگ لا الہ الا اللہ کا کلمہ پڑھ لیں ۔

چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جو لوگ بھی ایمان نہیں لائے انہیں جریرۃ العرب سے نکال دیا گیا یا انہیں قتل کر دیا گیا ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی ہوش و ہوا رکھنے والا آدمی اس امر واقعہ کا انکار نہیں کر سکتا ۔ جریرۃ العرب کے باہر دنیا کو اتنی چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ اسلام کا کلمہ نہیں پڑھتے تو نہ پڑھیں لیکن انہیں اسلام کا تابع بن کر رہنا ہوگا نہیں معلوم اتنی بڑی بڑی حقیقتوں کا انکار کرنے کی برادر محترم کو کیسے جرات ہوتی ہے ؟

آسان اور مشکل چیز

سبھی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ رسولؐ کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپؐ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کا انتخاب کرتے تھے (بخاری)۔

برادر محترم نے حدیث کا آخری حصہ چھوڑا دیا ہے پوری حدیث یوں ہے۔
نبیؐ کو دو امر کے درمیان اختیار نہیں دیا گیا مگر ان میں سے آپؐ نے آسان ترین کو اختیار فرمایا جب کہ وہ گناہ نہ ہوا اگر وہ گناہ ہوتا تو آپؐ اس سے ہمت زیادہ دور ہوتے اور آپؐ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی معاملے میں انتقام نہیں لیا الا یہ کہ اللہ کی محترم ٹھرائی ہوئی کسی چیز کی حرمت پامال کی جاتی ہو تو آپؐ اللہ کے لئے انتقام لیتے۔

اس حدیث کا ذکر کرتے ہوئے امام مسلم نے جو باب باندھا ہے اس میں صراحت کر دی ہے کہ یہاں انتخاب کی بات دو مباح چیزوں کے درمیان کے متعلق ہے۔ برادر محترم نے جس انداز میں اس حدیث کو پیش کیا ہے اس کو دیکھ کر ایک بچہ کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہو گا کہ جب قریش مکہ نے کئی آسان چیزوں کی پیش کش کی تو اللہ کے رسولؐ ان سب کو ٹھکرا کر ان سے کشمکش کے لئے کیوں بصد ہو گئے۔

اسلام کا سیاسی نظام:

”جہاں تک خلافت یا اسلام کے سیاسی نظام کا سوال ہے، وہ ایک مشروط حکم ہے نہ کہ مطلق حکم۔ اس کے قیام کے لئے تشدد یا جنگ کا طریقہ اختیار کرنا کسی بھی طرح اسلام میں جائز نہیں۔ کیوں کہ جب بھی ایسا کیا جائے گا تو موجودہ (Existing) نظام سے عملی ٹکراؤ پیش آجائے گا۔ اور قائم شدہ نظام ایسی تحریک کو

دبانے کے لئے طاقت کا استعمال کرے گا۔ اس طرح جو چیز پہلے چھوٹا شر (Lesser Evil) کے درجہ میں تھی وہ زیادہ بڑا شر (Greater Evil) کی سطح تک پہنچ جائے گی۔ مزید یہ کہ عملی ٹکراؤ پیش آنے کے نتیجہ میں پرامن دائرہ میں کام کرنے کے مواقع بھی برباد ہو جائیں گے۔ ایسا ہر اقدام قرآن کے الفاظ میں فساد فی الارض (۵:۲۰) قرار پائے گا۔ وہ ایک جرم ہو گا تا کہ کوئی اسلامی عمل۔ (صفحہ ۱۳۲)

یہاں اسلام کے سیاسی نظام یا خلافت قائم کرنے مشروط حکم بتانے کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ دوسری صورت میں برسرِ اقتدار نظام کو عملی ٹکراؤ کی ضرورت آئے گی اور اس عملی ٹکراؤ کے نتیجہ میں جو صورت حال پیش آئے گی وہ فساد فی الارض کی تعریف میں آئے گی یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ فساد فی الارض کی تعریف کیا اللہ کے رسول آپ کے صحابہ اور انبیاء سابقین کو معلوم نہیں تھی؟ کہ یہ اللہ کے بندے جہاں بھی رہے اور گئے وقت کے نمرود، فرعون، ابو جہل، ابولہب سے ٹکراتے رہے۔

جنگ میں پہل:

”قرآن کے مطابق دوسروں کے خلاف جنگ کا آغاز کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں (۱۳۰۹) اسلام میں جنگ صرف دفاع کے لئے ہے نہ کہ جارحیت کے لئے (۱۹۰:۲) مزید یہ کہ اگر کوئی گروہ جنگ چھیڑنا چاہے تب بھی آخری حد تک اعراض کی کوشش کی جائے گی اسلام میں دفاعی جنگ بھی اسی وقت ہے جب کہ فریق ثانی نے عملی جارحیت کر کے کوئی انتخاب (Option) ہمارے لئے نہ رکھا ہو۔“ (صفحہ ۱۳۲ تا ۱۳۳)

اس موقع پر ہم برادر محترم سے تین باتیں عرض کریں گے۔ سورہ توبہ کی صرف ایک آیت نمبر (۲۹) پر غور کیجئے اس آیت میں قتال کا جو حکم دیا گیا ہے۔ وہ دفاع کے لئے ہے یا اقدام کے لئے؟ دوسری بات یہ ہے کہ روم و فارس سے جو ٹکراؤ ہوا

تھا وہ ان ملکوں کے جارحیت کی بناء پر ہوا تھا یا بالقصد اظہار دین اور غلبہ دین کے لئے ہوا تھا ؟ سمیری بات ہم صاحب ہدایہ کے ایک جملہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائیں گے وہ لکھتے ہیں

”قتال الکفار واجب وان لم یبدؤا“

یعنی کفار سے جنگ واجب ہے اس عبارت میں یہ بتانا ہرگز مقصود نہیں ہے کہ کفار کے ساتھ جنگ میں پہل بھی کی جاسکتی ہے اگر ایسی بات ہوتی تو ”واجب“ کے بجائے ”جائز“ کا لفظ استعمال ہوتا لفظ ”واجب“ پہل اور اقدام کو جائز ہی نہیں واجب بتاتا ہے فتح القدر میں ہے

قتال الکفار الذین لم یسلموا و ہم من مشرک العرب او لم یسلموا و لم یعطوا الجزایۃ من غیر ہم واجب وان لم یبدؤا“
یعنی ان کفار سے جو لہمان نہ لائیں اور وہ مشرکین عرب میں سے ہوں یا غیر عرب میں سے جو لہمان نہ لائیں اور جزیہ نہ دیں جنگ واجب ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ قتال کو واجب بتایا گیا ہے اور صلح محض جائز ہے اور اس کا جواز بھی مشروط ہے۔

مسلم ملک یا غیر مسلم ملک:

مسلمان خواہ کسی مسلم ملک میں ہوں یا غیر مسلم ملک میں، دونوں حالتوں میں انھیں ملک کے دستور اور قانون کا پابند رہنا چاہئے۔ دستور اور قانون کی خلاف ورزی کرنا یا اسلام کے نام پر غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہونا کسی بھی حال میں مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ قانون کی حد ہی ہمارے عمل کی حد بھی ہے۔ جہاں قانونی اجازت کی حد آجائے، اس کے بعد ہمارے لئے صبر ہے نہ کہ ٹکراؤ اور قانون شکنی۔

جو مسلمان غیر مسلم ملکوں میں رہتے ہیں، یعنی ان ملکوں میں جہاں کی

اکثریت غیر مسلم ہے اور وہاں ان کی مرضی کا سیاسی نظام قائم ہے، وہاں مسلمان کی حیثیت معاہدہ کی ہے، خواہ دونوں کے درمیان لفظی معاہدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ وہاں بسنے والے مسلمانوں کے لئے ملکی قوانین و ضوابط کی پابندی لازمی طور پر ضروری ہے۔ کسی بھی عذر کی بناء پر اس کی خلاف ورزی ان مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

ان غیر مسلم ملکوں میں ہر جگہ اپنا ایک دستور اور قانونی نظام ہے۔ یہ دستور اور قانون کسی چیز کو جائز (Law Ful) اور کسی چیز کو ناجائز (Un Law) قرار دیتا ہے۔ جب بھی کوئی مسلمان کسی ایسے ملک میں داخل ہوتا ہے تو اپنے آپ ہی وہ ملک کے قانونی نظام کے تحت آجاتا ہے۔ ایسے مسلمان اور ایسے ملک کے درمیان اپنے آپ ایک خاموش معاہدہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ مذکورہ مسلمان اس ملکی نظام کا مکمل طور پر لفظی اور معنوی پابند رہے گا۔ کسی بھی حال میں وہ اس کی کھلی یا چھپی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

ایسی حالت میں کسی غیر مسلم ملک میں بسنے والے مسلمان کے لئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یا تو وہ مذکورہ ملک کے قانون کی مکمل پابندی کر کے وہاں رہے، یا اگر اس کو اس سے اختلاف ہے تو خاموشی کے ساتھ ملک کو چھوڑ کر وہاں سے باہر چلا جائے۔ سمیرا انتخاب (Option) یعنی ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہاں مقیم رہنا، یقینی طور پر ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ ایسا عمل سراسر ناجائز ہے۔ جو لوگ اس قسم کا سمیرا انتخاب اختیار کریں وہ اسلامی اصول کے مطابق مجرم ہیں۔ اور وہ بلاشبہ خدا کے یہاں سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔ ملکی نظام کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں اگر نظام سے ٹکراؤ پیش آئے تو وہ دفاع کا مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ ایک مجرمانہ فعل ہوگا۔ ایسے موقع پر شریعت کا حکم یہ ہے کہ مسلمان ایک طرفہ واپسی کے ذریعہ ٹکراؤ کی حالت کو ختم کر دیں نہ کہ اس کو دفاع قرار دے کر نظام کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامک ایکٹوزم صرف وہی ہے جو دعوت کی راہ سے اور دعوت کے اسلوب میں چلائی جائے۔ دعوت کے اسلوب میں کی جانے والی جدوجہد کو اس دنیا میں اللہ کی نصرت ملتی ہے۔ اس لئے صرف وہی دنیا میں کامیاب ہوتی ہے۔ دوسرے اسلوب کی کوئی جدوجہد خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ خواہ اس کا نام اسلامی اور قرآنی جدوجہد ہی کیوں نہ رکھ دیا گیا ہو۔ (صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۴)

اس پورے لمبے اقتباس میں کئی مسائل قابل غور ہیں

۱۔ مسلم اور غیر مسلم ملک یعنی مسلمان حاکم اور غیر مسلمان حاکم دونوں کو اطاعت کے معاملہ میں برابر نہیں رکھا جاسکتا قرآن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہاں پر "مکرم" (یعنی تم میں سے) کا لفظ بھی آیا ہے۔ جس سے اس بات کی صراحت ہو جاتی ہے کہ جس "اولی الامر" یعنی صاحب اقتدار و اختیار کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے وہ مسلمان ہو نہ کہ کافر مشرک۔ اسی کے ساتھ صراحت کے ساتھ کافر و مشرک کی اطاعت سے متعدد جگہ قرآن میں منع کیا گیا ہے۔ اس لئے کافر و مشرک حکمران کی اطاعت کی بات کرنی شرعی لحاظ سے بالکل ناجائز و درست ہے۔

۲۔ جو مسلمان غیر مسلم ملکوں میں رہتے ہیں ہم نے یہ مانا کہ ان کی حیثیت معاہدہ کی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ معاہدہ کتنی مدت کے لئے ہے شرعی اعتبار سے کیا کوئی معاہدہ بلا معیاد بھی ہو سکتا ہے؟ اور پھر کیا وہ معاہدہ ٹوٹ نہیں سکتا؟ اگر فریق ثانی اس معاہدہ کا لحاظ وہ خیال نہ کرے اور بار بار معاہدہ کی خلاف ورزی کرے دور نبوی میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہودیوں سے کیا ہوا معاہدہ صرف اس وجہ سے کالعدم قرار پایا کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان بیوی کے ساتھ ناشائستہ حرکت کی

تھی۔

۳۔ یہ آپ نے صحیح فرمایا کہ کسی غیر مسلم ملک میں بسنے والے مسلمان کے لئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے ایک تو وہ یہ کہ مذکورہ ملک کے قانون کی مکمل پابندی کرے یا اگر اس کو اس سے اختلاف ہے تو خاموشی کے ساتھ ملک کو چھوڑ کر وہاں سے باہر چلا جائے۔

تیسری صورت اختیار کرنا وہ اسلامی اصول کے مطابق مجرم ہے یہ بات جس شکل میں برادر محترم نے پیش کی ہے وہ جزوی حیثیت سے صحیح ہو سکتی ہے لیکن اگر صورت حال یہ ہو ہمارے ملک پر کوئی غیر مسلم خواہ وہ انگریز ہوں یا اور کوئی زبردستی قابض ہو گئے ہیں اور بزور ہم اپنا حکم چلا رہے ہوں تو کیا اس صورت میں بھی ایک مسلمان کے لئے صرف دو ہی راہیں ہیں۔ ۲ آخر جبر و ظلم کے خلاف اس کے لئے اٹھنا کیوں صحیح نہیں ہوگا؟ اور وہ کیوں مجرم ہوگا اور وہ کیوں خدا کے یہاں سزا کا مستحق قرار پائے گا؟

۴۔ ملکی نظام کے خلاف ورزی کے نتیجہ میں نہیں بلکہ ملکی نظام اپنے معاہدہ یعنی اپنے دستور کی خلاف ورزی کرے اور اس صورت میں ٹکراؤ پیش آئے تو وہ دفاع کا مسئلہ کیوں نہیں ہوگا؟ وہ ایک مجرمانہ فعل کیوں ہوگا اور کس بنیاد پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسے موقع پر شریعت کا حکم یہ ہے کہ مسلمان ایک طرفہ داپسی کے ذریعہ ٹکراؤ کی حالت کو ختم کر دیں اور دفاع نہ کریں۔

۵۔ اللہ کی نصرت ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت آئی جب کہ دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ میدان بدر میں تین سو تیرہ مسلمان اپنا سب کچھ لے کر آگئے اور باطل کے خلاف اپنی آخری جان و مال کی پونجی قربان کر دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ دعوت، ہجرت اور جہاد کو ایک دوسرے سے مربوط رکھ کر آپ سوچیں تو صحیح نتیجہ تک پہنچیں گے ورنہ گمراہیوں کے لٹ و لٹ میں ضلالت میں ماریاں مارتے رہیں گے۔

آپریشن رحمت کے خلاف نہیں ہے:

”اسلام بنیادی طور پر ایک امن پسند مذہب ہے اسی لئے پیغمبر اسلام کو رحمت العالمین کہا گیا ہے یعنی سارے عالم کے لئے رحمت گویا پیغمبر اسلام پیغمبر رحمت ہیں نہ کہ پیغمبر حرب: آپ کا طریقہ (Non - Violence) ہے نہ کہ تشدد۔“ (صفحہ ۱۵۲)

اس میں کیا شک ہے کہ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے جس طرح ایک ڈاکٹر صحت پسند ہونے کے باوجود صحت ہی کے لئے نشتر چلانے پر مجبور ہو جاتا ہے اسی طرح ایک امن پسند مذہب امن کے لئے ہی حرب و ضرب کا راستہ اختیار کرتا ہے جس طرح صحت کے لئے نشتر اور آپریشن کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح امن کی منزل تک پہنچنے کے لئے اسلام نے تلوار اٹھانے کو ضروری قرار دیا ہے اگر نشتر چلانے والے ڈاکٹر کو بے رحم اور تشدد اختیار کرنے والا نہیں کہہ سکتے اسی طرح تلوار اٹھانے کی بات کرنے والے مذہب کو تشدد اور حرب کا مذہب نہیں کہہ سکتے وہ بہر صورت امن پسند یہ مذہب ہی ہوگا۔

کوئی شرعی حکم معلوم کرنے کی وہی ترتیب ہے جو یمن جاتے ہوئے حضرت معاذ نے بتائی تھی اور جو اصول فقہ میں بھی بتائی گئی ہے کہ قرآن پھر سنت پھر اجماع اور پھر قیاس۔ یعنی قیاس کا اصول اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کہ قرآن اور سنت و اجماع میں حکم نہیں ملتا قرآن و سنت اور اجماع کے ہوتے ہوئے قیاس نہیں کیا جاتا ہے۔ اور بالکل سیدھی سی بات ہے کہ جب ایک حکم خدا اور رسول سے ہمیں مل گیا تو پھر اپنی عقل لگانے کی کیا ضرورت، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص اپنی عقل اور قیاس لگاتا ہے تو یہ بڑی گمراہی اور ضلالت کا کام ہوگا۔

ہبیز کو فقہاء نے شراب اور ہبیز کی قدر مشترک علت کی بناء حرام اس لئے

قرار دیا کہ ہبیز کا حکم کتاب و سنت میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں تھا اگر ہبیز کا حکم کتاب و سنت میں موجود ہوتا تو قیاس کی ضرورت کیوں پڑتی ؟

جس طرح مسلم حکمران کی اطاعت یا اس سے بغاوت کے سلسلہ میں واضح اور صریح حکم موجود ہے اسی طرح غیر مسلم حکمران کے بارے میں بھی قرآن میں صریح ہدایات موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے قیاس کرنے کی کوشش کرنا شریعت کے صریح احکام کو ٹھکرادینے کے برابر ہے۔ قرآن میں جہاد پر اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے بعد اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہاں پر ”منکم“ کی قید بھی لگائی گئی ہے یعنی وہ تم میں سے ہو۔ مسلمان ہو۔ پھر اہل بیت کے آخری ٹکڑے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حاکم کی اطاعت بھی اسی وقت تک کی جائے گی جب تک اللہ اور اس کے رسولؐ کے منشاء کے خلاف حکم نہیں دیتا اسی کو کہتے ہیں اللہ اور رسولؐ کے علاوہ کسی کی بھی اطاعت کی جائیگی تو وہ معروف میں کی جائیگی منکر میں نہیں۔ اس کے ساتھ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکمران کا فسق برداشت کیا جائیگا اس کے خلاف بغاوت منع ہے الا یہ کہ وہ صریح کفر کا ارتکاب کرے سبہاں سے یہ بات خود معلوم ہو جاتی ہے کہ کفر بواح کی صورت میں مسلم حکمران کے خلاف بغاوت جائز ہے ظاہر ہے کہ جب کوئی حکمران سرے سے مسلم ہے ہی نہیں تو اس کی اطاعت کا کیا سوال ؟ اور اس کے خلاف جانا کیوں منع ہوگا ؟ غیر مسلم کی اطاعت کرنے سے صریح طور پر مندرجہ ذیل آیات میں منع کیا گیا ہے۔

غیر مسلم حکمران کا معاملہ

جہاں تک مسلم حکمران کا معاملہ ہے، اس کے خلاف خروج کی حرمت صریح احادیث سے ثابت ہے۔ اسی لیے تمام علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے، جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حکمران اگر غیر مسلم ہو تو اس کے

آئے گی وہ یہ ہے کہ ۔۔۔ پیغمبر اسلام نے صراحت کے ساتھ غیر عادل مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج (بغاوت) سے منع فرمایا ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس قسم کا اقدام زیادہ بڑا نقصان بدامنی اور جان و مال کی تباہی پیدا کرے گا ۔

معلوم ہوا کہ اس ممانعت کی اصل علت شدید تر برائی کا پیدا ہونا ہے ۔ یہ شدید تر برائی اس وقت بھی پوری طرح ظہور میں آئے گی جب کہ حکمران غیر مسلم ہو ۔ گویا دونوں جگہ علت کا اشتراک پایا جا رہا ہے ۔ اور جب علت مشترک ہے تو شرعی اصول کے مطابق حکم بھی مشترک ہو گا ۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت میں جس طرح غیر عادل مسلم حکمران کے خلاف بغاوت ناجائز ہے اسی طرح غیر مسلم حکمران کے خلاف بھی بغاوت ناجائز ہے خواہ وہ لوگوں کو غیر عادل کیوں نہ دکھائی دیتا ہو ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس خاص مسئلہ میں مسلم حکمران اور غیر مسلم حکمران کا فرق محض اضافی ہے ۔ کیونکہ حکمران کے خلاف خروج کی ممانعت اس لیے نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہے ۔ یہ ممانعت صرف اس لیے ہے کہ اس قسم کا فعل زیادہ بڑا شر پیدا کرنے کا سبب بنے گا ۔ ایسا اقدام عملی طور پر اچھے نتیجہ والا (- COUNTER) PRODUCTIVE ثابت ہو گا ۔ اٹھنے والا اپنے خیال کے مطابق تو ظلم کو ختم کرنے کے لیے اٹھے گا ۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے عظیم تر ظلم ظہور میں آئے گا ۔ (صفحہ ۱۵۶)

اوپر کا پورا المباحثہ بے علمی اور بے خبری کی اپنی آپ ایک ناور مثال ہے شرعی احکام کے چار ماخذ ہیں کتب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس ۔ مگر اتنا معلوم ہونا کافی نہیں ہے اسی کے ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ان میں سے کس کا کیا مقام ہے اور ان میں کیا ترتیب ہے ورنہ ہو گا یہ کہ ایک ہی مسئلہ میں ایک شخص قرآن کو پکڑ کر ایک طرف جانے کا دوسرا سنت کو لے کر دوسرے طرف، تیسرا اجماع اور چوتھا قیاس کو لے کر تیسری اور چوتھی طرف جانے کا اس لیے ترتیب کا لحاظ ضروری ہے ۔

یا ایہا النبی اتق اللہ ولا تطیع الکافرین والمنافقین ان
اللہ کان علیماً حکیماً (الاحزاب ۱)

اے نبی اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو حقیقت میں علیم و
حکیم تو اللہ ہی ہے۔

یہی بات اسی سورہ کے آیت نمبر ۴۸ میں بھی کہی گئی ہے۔

فلا تطع الکافرین وجامد مہم بہ جہاد اکبیرا (فرقان ۵۲)
ہیں اے نبی کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لیکر ان کے ساتھ
زبردست جہاد کرو۔

ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ہواہ وکان امرا
فرطاً (کھف ۲۸)

کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل
کر دیا اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار
افراط و تفریط پر مبنی ہے۔

ان الذین ارتدوا علی ادبارہم من بعد ما تبیین لہم الہدی
الشیطان سول لہم واملی لہم ذلک بانہم قالوا للذین کرہوا
ما نزل اللہ منطیعکم فی بعض الامر واللہ یعلم اسرارہم (محمد ۲۵ تا
۲۶)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اس سے پھر گئے ان
کے لیے شیطان نے اس روش کو آسان بنا دیا ہے اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کے
لیے دراز رکھا ہے اسی لیے انہوں نے اللہ کے مازل کردہ دین کو مایوس کرنے والوں
سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہیں مانیں گے اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب
جانتا ہے۔

خاص طور سے اس آخری آیت پر غور کیجئے کتنی سخت بات کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ ان کے لیے اپنی اطاعت کا دم بھرتے ہیں جنہوں نے اللہ کی اتاری ہوئی وحی کو ناپسند کیا ہے وہ گویا ارتداد کے مجرم ہیں یہ بھی حکم ان پر لگایا جا رہا ہے جو بعض معاملات میں کفار کی بات ماننے اور اطاعت کرنے کی بات کرتے ہیں اس پر ان لوگوں کے انجام کو قیاس کیا جاسکتا ہے جو مجبوری اور اضطرار کی وجہ سے نہیں بلکہ خوش دلی کے ساتھ اور جائز سمجھتے ہوئے کفار و مشرکین کی اطاعت کرتے ہیں۔

پھر ذرا سوچئے حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے خلاف بغاوت کی، حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی تابعداری سے انکار کیا ہمارے نبی حضرت محمدؐ نے سرداران قریش کی بات نہ مانی اور اس کی وجہ سے پورے ماحول کا سکون و چین ختم ہو گیا اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے نعوذ باللہ یہ فساد فی الارض تھا؟

ایک عجیب تنقید

برادر محترم لکھتے ہیں کہ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک کتاب "تحقیقات" ہے۔ اس میں مصنف کے وہ مضامین جمع کئے گئے ہیں جو انہوں نے اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم پر لکھے تھے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مغربی تہذیب سراسر باطل تہذیب ہے۔ وہریت، الحاد، لامذہبیت اور مادہ پرستی نے اس کو پیدا کیا ہے۔ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی نے اس تہذیب کو جنم دیا ہے (صفحہ ۹) اسلام کے اصول تمدن و تہذیب اور مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں (صفحہ ۲۵) وہ تخم خبیث جو مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں بویا گیا تھا، چند صدیوں کے اندر تمدن و تہذیب کا ایک عظیم الشان شجر خبیث بن کر اٹھا ہے جس کے پھل میٹھے مگر زہر آلود ہیں۔ جس کے پھول خوش نما مگر خار دار ہیں۔ جس کی شاخیں بہار کا منظر پیش کرتی ہیں مگر وہ ایسی زہریلی ہوا اگل رہی جو نظر نہیں آتی اور اندر ہی اندر

نوع بشری کے خون کو مسموم کیے جا رہی ہیں (صفحہ ۲۸-۲۹)

اس قسم کے مضامین صرف جدید تہذیب سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ اس بے خبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ کے علماء کے لیے یہ تہذیب صرف نفرت و حقارت کا موضوع بن گئی۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئے مثبت امکانات کو دریافت کرنے سے قاصر رہے۔ اور اسی لیے وہ اس کو اپنے حق میں استعمال بھی نہ کر سکے۔ (صفحہ ۲۰۳)

اس عبارت کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے مغربی تہذیب کی خوب تعریف کی ہوتی تو مولانا کو برادر محترم باخبر ہونے کا اعزاز دیتے لیکن انہوں نے مغربی تہذیب کو اس کے اپنے رنگ میں پیش کیا اس لیے وہ بے خبری کے طعنہ کے سزاوار ٹھہرے۔ یہ کیسا عجیب معیار تنقید ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہ ہدایت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ایک آیت قرآنی سے غلط استدلال

(قرآن میں ایک آیت معمولی لفظی فرق کے ساتھ دو جگہ آئی ہے۔ سورہ البقرہ ۱۹۳، اور سورہ الانفال ۳۹۔ آخر الذکر آیت یہاں نقل کی جاتی ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كَلَهُ لِلَّهِ . فَإِنْ
انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ .

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لئے
ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ دیکھنے والا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔

فتنہ کے لفظی معنی آزمائش اور ابتلاء ہیں (لسان العرب ۱۳ / ۳۱۴) صحیح بخاری
(کتاب النکاح) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا تَرَكَتُ بَعْدِي فِتْنَةً أَضُرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ (فتح الباری
۳۱/۹)

یعنی میں نے اپنے بعد کوئی آزمائش نہیں چھوڑی جو مردوں کے اوپر عورتوں
سے زیادہ ضرر رساں ہو۔

مذکورہ آیت میں فتنہ کا لفظ بھی اسی معنی میں ہے۔ امام حسن بصری تابعی (۲۱۱ھ)
نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ

حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ

کا مطلب ہے:

حَتَّى لَا يَكُونَ بَلَاءٌ

(تفسیر طبری ۹ / ۲۳۸) یعنی ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ آزمائش کی حالت

باقی نہ رہے۔

اس آیت میں فتنہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو مذہبی ایذا رسانی)

religious) persecution) کہا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے پوری تاریخ میں مذہب کی آزادی نہ تھی۔ جو طبقہ برسرِ اقتدار ہوتا وہ اپنے سوا دوسرے مذہب کے لوگوں کو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس سے الگ کسی اور مذہب کو مانیں، یا کسی اور مذہبی طریقہ پر عمل کریں۔

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلام جب عرب میں شروع ہوا تو اس وقت وہاں شرک اور مشرکین کا غلبہ تھا۔ انہوں نے پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھیوں کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنایا۔ کیوں کہ ان کا عقیدہ مشرکین کے عقیدہ سے مختلف تھا وہ ان کے طریقہ کو چھوڑ کر دوسرے طریقہ پر خدا کی عبادت کرتے تھے۔ یہ ظلم و ستم آخر کار جنگ تک پہنچا۔ اس وقت اہل لہمان کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں سے لڑو، یہاں تک کہ مذہبی جبر کا خاتمہ ہو جائے۔ ہر آدمی اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کے لئے آزاد ہو جائے۔

آئیت کا دوسرا حصہ

وَيَكُونُ الدِّينُ كُلُّهُ

۔ یہ پہلے حصہ کی مزید وضاحت ہے۔ آئیت کے پہلے حصہ میں جو بات سبلی انداز میں کہی گئی ہے، اسی بات کو دوسرے حصہ میں لہجائی انداز میں دہرایا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آئیت کا مطلب یہ ہے کہ ۔۔۔ فتنہ کو ختم کر دو، تاکہ عدم فتنہ کی حالت دنیا میں پوری طرح قائم ہو جائے۔

اس آئیت میں دین کا لفظ دین شرعی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ دین فطری کے معنی میں ہے۔ یعنی اس سے مراد وہ دین نہیں ہے جو الفاظ کی صورت میں ہمیں عطا کیا گیا ہے۔ اس سے مراد وہ قانون فطرت ہے جو غیر ملفوظ طور پر براہ راست خدا کی طرف سے سارے عالم میں نافذ ہے۔

قرآن میں دین کا لفظ اس دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً فرمایا:
 وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا أَفَغَيْرَ اللَّهِ
 تَتَّقُونَ (النحل ۵۲)

یعنی خدا ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور
 اسی کے لئے دین ہے (ساری کائنات میں) ہمیشہ، پھر کیا تم اللہ کے سوا کسی اور سے
 ڈرتے ہو۔

سورہ نحل کی اس آیت میں دین سے مراد وہ دین فطری یا قانون فطری ہے جو
 بالفعل ساری کائنات میں مستقل طور پر ہر آن قائم ہے۔ اس معلوم واقعہ کو بطور
 شہادت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی قدرت اتنی زیادہ ہے کہ وہ ساری کائنات
 کو ہر آن ابدی طور پر مسخر کئے ہوئے ہے تو تم کو اسی سے ڈرنا چاہئے، اور اپنی آزادی
 کو اسی کی ماتحتی کے دائرہ میں استعمال کرنا چاہئے (فکر اسلامی صفحہ ۲۳۵-۲۳۶)

اوپر قرآنی آیت پر برادر م محترم کے خیالات آپ نے پڑھ لئے۔ یہ آیت چونکہ
 موصوف کے فکری قلعہ کو بالکل مہندم کر دیتی ہے اس لئے بھرپور ادور لگایا ہے آیت
 کی ایک غلط تفسیر کرنے کی۔

آیت میں حکم قتال کی وجہ بتائی جا رہی ہے وہ وجہ بظاہر دو معلوم ہو رہی ہے
 ایک فتنہ کو ختم کرنے اور دوسرے پورا دین اللہ کے لئے ہونے کے لئے۔ لیکن بات
 ایک ہی ہے جس کا معنی اور مثبت دونوں پہلو کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ
 جب تک فتنہ ختم نہیں ہوگا اس وقت تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پورا دین اللہ کے لئے
 ہو گیا اسی طرح جب تک پورا دین اللہ کے لئے نہ ہوگا اس وقت تک فتنہ کا ختم ہونا
 نہیں سمجھا جاسکتا۔ برادر محترم کے مطابق آج فتنہ ختم ہو گیا ہے اس لئے حکم قتال بھی
 باقی نہیں رہا۔ بالفرض یہ مان لیا جائے کہ فتنہ ختم ہو گیا۔ تو کیا پورا دین اللہ کے لئے
 ہو گیا ہے۔ یہ مشکل سوال تھا موصوف کے لئے، جس کی وجہ سے انہوں نے دین کا

مفہوم ہی بدل دیا۔ اور فرمادیا کہ اس آیت میں دین کا لفظ دین شرعی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ دین فطری کے معنی میں ہے لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ دین فطری یا قانون فطری تو بالکل ساری کائنات میں مستقل طور پر ہر آن قائم ہے اس کے لئے حکم قتال دینے کی ضرورت کیا تھی۔ تنکوینی طور پر کائنات کا ذرہ ذرہ حتیٰ کہ کافر اور مشرک بھی مومن اور مسلم ہے۔ تنکوینی اسلام کی دعوت لے کر ابھیاء نہیں آئے۔ ہمیشہ تشریحی اسلام ان کا موضوع رہا ہے

آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے تین سوالوں کا جواب معلوم کیجئے۔

(۱) فتنہ سے کیا مراد ہے؟

(۲) دین سے کیا مراد ہے؟

(۳) کفار کے باز رہنے کے کیا معنی ہیں۔

ان سوالوں کا جواب ہم عربی مفسرین کے الفاظ میں یہاں دیتے ہیں۔
عربی میں مختصر ترین مشہور تفسیر، تفسیر جلالین ہے جو درس نظامی کا ایک اہم جزء ہے۔ اور عموماً ابتدائی درجات میں پڑھائی جاتی ہے۔

”قاتلوہم حتی لا تکنون“ ”توجد“ ”فتنة“ ”شرك“ ”ویکون
الدین“ ”العبادة لله وحده لا یعبد سواہ“ ”فان انتھوا“ ”عن
الشرك“ =

اس عبارت میں تینوں سوالوں کا جواب آگیا ہے ایک اردو داں بھی سمجھ سکتا
ہے ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے فتنہ کی تفسیر شرک سے، دین کی تفسیر عبادت سے کی
گئی ہے پھر کس چیز سے باز آنا ہے بتایا ”عن الشرك“ ”شرك“ سے۔
تفسیر القرطبی میں ہے۔

ہوا امر بقتال مطلق لا بشرط ان یبدا الکفار دلیل ذلک
قوله تعالى ”ویکون الدین لله“ وقال علیه السلام امرت ان

اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فدللت الآية والحديث
على ان سبب القتال هو الكفر لانه قال حتى لا تكون فتنة، اي
كفر الخ

یہ مطلق قتال کا حکم ہے اس شرط کے ساتھ نہیں کہ کفار جنگ کی ابتداء
کریں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول ہے ”ویكون الدين لله“ اور نبی کریم صلی
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک
کہ لوگ لا اله الا الله کہہ دیں پس آیت اور حدیث دونوں سے معلوم ہوا کہ قتال
کا سبب ان کا کفر ہے کیونکہ قرآن میں ”حتى لا تكون فتنة“ آیا ہے فتنة یعنی
کفر۔

تفسیر روح المعانی میں ہے۔

المراد من ”الفتنة“ الشرک

یعنی فتنہ سے مراد شرک ہے۔

والتقدير ”فان انتھوا“ واسلموا

تقدیر کلام یوں ہے پس وہ اگر باز آجائیں اور اسلام قبول کر لیں۔ طوالت
سے بچنے کے لئے تفسیر امام رازی کا صرف ایک فقرہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

فصار التقدير كانه تعالى قال وقتلوهم حتى يزول

الكفر ويثبت الاسلام...

پس تقدیر کلام یوں ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ان سے جنگ کرو یہاں
تک کہ کفر ختم ہو جائے اور اسلام کو ثبات مل جائے۔

مفسرین کی ان تصریحات کے خلاف جانے کی بنا پر ہرادر محترم کو کئی بے تکلی
تاویلات کا سہارا لینا پڑا ہے اور یہ کہہ کر تو غضب دھادیا کہ دین سے مراد لفظوں میں
آیا ہوا دین نہیں ہے۔